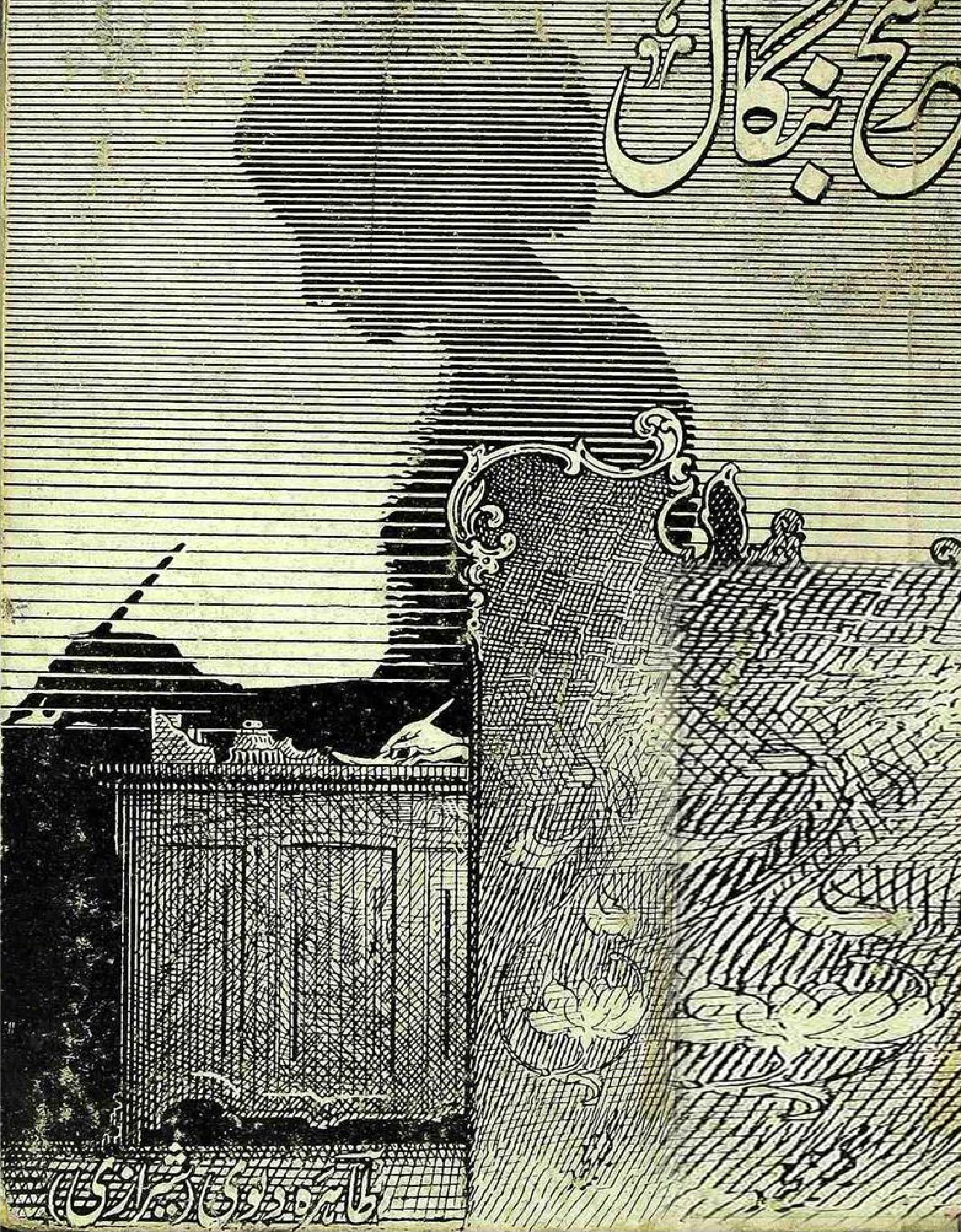

ح بنگال

طاہرہ دیوی (شیرازی)

ANJUMAN-I-TARAQQI-E-URDU
ALIGARH U.P.

سحرِ بنگال

محترمہ طاہرہ دیوی شیرازی

کے افسانوں کا مجموعہ

ناشر

ساقی بک ڈپو، دہلی

طبع اول | جولائی ۱۹۳۵ء | قیمت

ادریس المطابع دہلی

لکھی جائینگی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہونگی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

اقبال

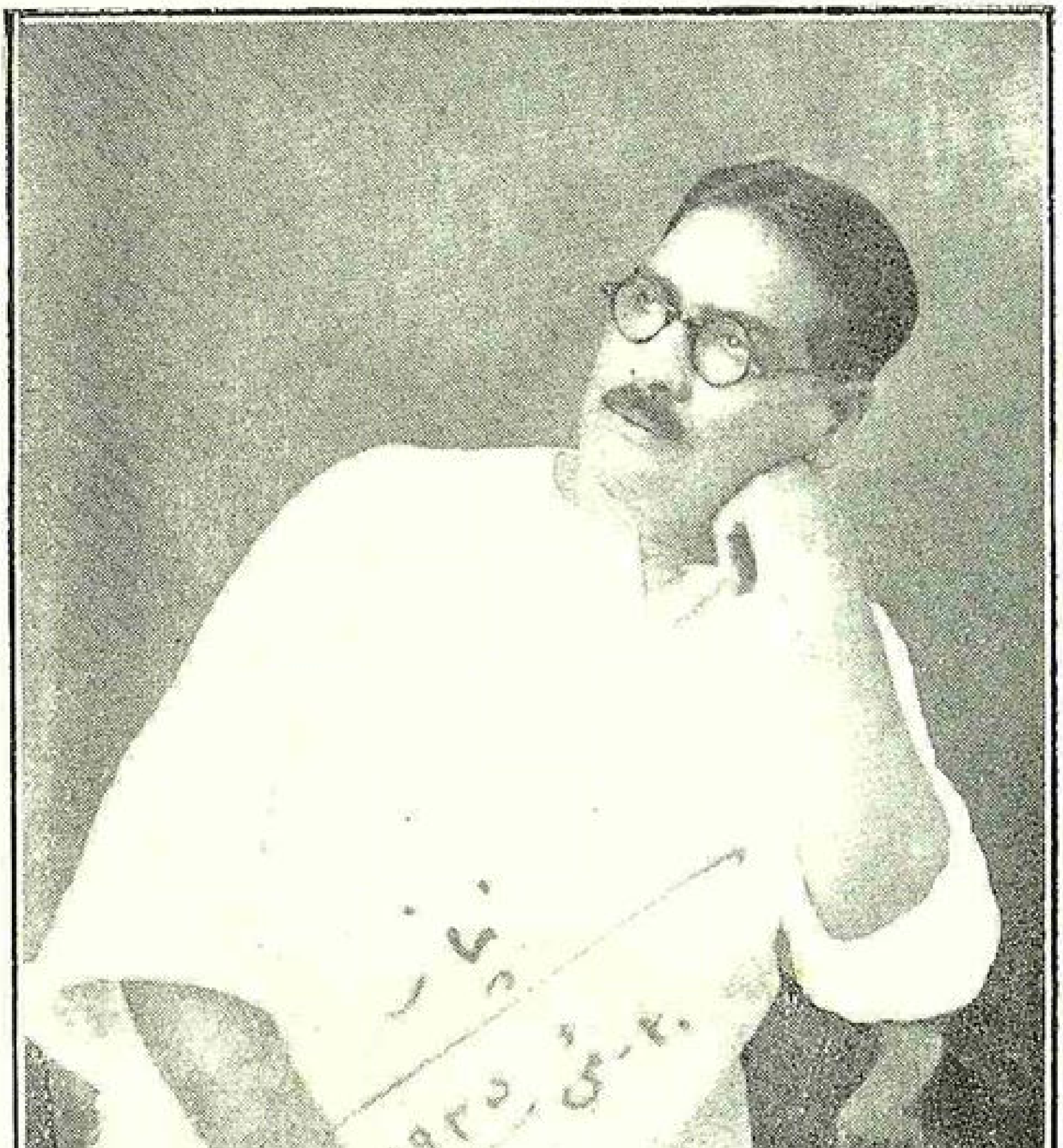

نذرِ عقیدت

علّامہ نیاز فتحپوری

کی

خدمت میں۔

طاہرہ دیوی شیرازی

تفصیلِ نقوش

نمبر شمار	عنوان	اشاعت اوّلین	صفحہ
۱	دُخترِ کفش دوز	نگار۔ لکھنؤ	۹
۲	سنجوگ	ساقی۔ دہلی	۲۵
۳	خوابِ رنگیں	ادبی دُنیا۔ لاہور	۴۳
۴	افسانہائے عشق	نیرنگِ خیال۔ لاہور	۵۲
۵	غلط فہمی	عصمت۔ دہلی	۵۹
۶	بازی گر	نگار، لکھنؤ۔ شاہجہاں۔ دہلی	۶۴
۷	سکون کی جستجو	نگار۔ لکھنؤ	۷۲
۸	مُقدّس معصیت	رومان لاہور۔ ساقی۔ دہلی	۸۵
۹	جھُوٹ	ساقی۔ دہلی	۹۰
۱۰	بنگالی ادب اور ایک گمنام شاعرہ	ہمایوں۔ لاہور	۹۶
۱۱	سوتیلے بچے	شاہجہاں۔ دہلی	۱۰۷
۱۲	بازیچۂ اطفال	لیلےٰ۔ لاہور	۱۱۴
۱۳	کیا عورت ناقص العقل ہے	تہذیبِ نسواں۔ لاہور	۱۲۴
۱۴	نصف ایکٹ کا ڈرامہ	عالمگیر۔ لاہور	۱۲۶

ANJUMAN-I-TARAQQI-E-URDU

دیباچہ

" طاہرہ دیوی شیرازی کا یہ دوسرا افسانہ ہے جو نگار میں شائع ہو رہا ہے۔ آپ نسبًا ہندو اور ازدواجاً مسلمان ہیں لیکن اعتقاد کے لحاظ سے بالکل میرے خیالات کی ہمنوا ہیں۔ یہ افسانہ فن کے لحاظ سے اردو میں اس ارتقائی درجہ کی چیز ہے۔ جہاں مردوں کا دماغ بھی مشکل ہی سے پہنچ سکتا ہے۔ چہ جائیکہ عورتیں۔ طاہرہ دیوی نہ صرف فارسی بلکہ فرانسیسی زبان کی بھی ماہر ہیں۔ اور غالباً یہیں سے یہ معمہ حل ہوتا ہے کہ انکی افسانہ نگاری میں یہ رنگ کہاں سے آیا۔ زبان کی صفائی و شگفتگی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بنگال کی ایک ہندو خاتون اتنی صاف و صحیح اُردو لکھنے میں کیونکر کامیاب ہو سکیں۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو علامہ نیاز فتحپوری نے کچھ میری شخصیت اور کچھ میرے ایک افسانے کے متعلق جو نگار بابتہ جولائی سنہ ۳۴ء میں شائع ہوا تھا قلمبند فرمائے۔ جب میں نے ان سطور کا مطالعہ کیا تو میری مسرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ نیاز جیسے بلند پایہ ادیب کی یہ رائے میرے لئے نہ صرف باعث عزت ہے بلکہ مجھ جیسی ایک مبتدی کی ان سے ہمت افزائی بھی ہوتی ہے۔

اردو میں لکھنے سے قبل ہندی، بنگالی یا انگریزی میں خصوصاً اور فارسی یا فرانسیسی میں محض "تذکرةً" میں نے جو کچھ تحریر کیا۔ وہ خارج از بحث ہے تاہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ ان زبانوں کے ذریعے میں نے قلم پر قدرت حاصل کر لی تو صحافت اُردو میں شہرت پانا میرے لئے بہت آسان

ہوگیا۔ چنانچہ ادیب فاضل کے امتحان سے فارغ ہوتے ہی میں نے تہیہ کرلیا کہ اس بساطِ ادب پر بھی کچھ مُہرے چلنے چاہئیں۔ اور خدا کے فضل سے میں ایک حد تک اپنی آرزو کی تکمیل میں کامیاب ہوگئی۔ مجھے افسوس ہے کہ اچانک علیل ہوجانے کے باعث بعض مدیران رسائل کی فرمائشات کماحقہٗ پوری نہ کرسکی۔ پھر بھی فخر سے کہہ سکتی ہوں کہ اسوقت ہندوستان کے تمام بلندپایہ جرائد میں بالواسطہ یا بلاواسطہ میرے افسانے شائع ہوچکے ہیں۔

پیشِ نظر مجموعے میں چند افسانے طبعزاد ہیں۔ اور باقی ماخوذ یا ترجمہ۔ میں نے ترجمہ کرتے وقت اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ اصل افسانے کی خوبیاں برقرار رہیں۔ چنانچہ ادبی دنیا کے سالنامے میں بطور تعارف لائق مدیر کے یہ الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں۔

"جنابہ طاہرہ دیوی صاحبہ کے "خوابِ رنگین" کے متعلق یہ عرض کردینا کافی ہے کہ اگر آج موپساں زندہ ہوتا تو یہ فیصلہ نہ کرسکتا کہ ترجمہ کونسا ہے۔ اور اصل کونسا"

میں نے ایران کے دوران قیام میں فرانسیسی ادب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا اسوقت کے کچھ نقوش دل و دماغ پر مرتسم رہ گئے تھے۔ ہندوستان آنیکے بعد ان کو اردو کے سانچوں میں ڈھالا تو انکی ہئیت مختلف ہوگئی بعض جگہ پلاٹ کے اندر بھی اہم تبدیلیاں پیدا کردی ہیں جس کے باعث ان کو اچھی طرح پہچاننا بھی دشوار ہے۔ کہ وہ اس "آواگون" سے قبل کس صورت میں تھے۔

اس مجموعے کو مرتب کرنے سے قبل تمام افسانوں پر ایک سرسری نظر ڈال لی گئی ہے۔ "دخترِ کفش دوز" کو علامہ نیاز نے بہت ترمیم و تنسیخ کے بعد شائع کیا تھا جس کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی۔ اور نہ میں

خود سمجھ سکی۔ اب میں نے اسکو اصل مسودے کے مطابق چھپوا دیا ہے۔ کیونکہ میں اس قطع و برید سے متفق نہیں ہوں۔ اگر نیاز صاحب کا اعتراض یہ ہو کہ اس میں بصورت موجودہ عریانی بہت ہے۔ تو میں کہونگی کہ عریانی ہی آرٹ کی معراج ہے۔ لہذا اس سے احتراز کرنا مناسب نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قارئین اسے بہت ہی زیادہ پسند فرمائینگے۔ کیونکہ نگار میں شائع ہونیکے بعد خود میں نے پانچ چھ مختلف رسائل میں اس کو چھپا ہوا دیکھا۔ اگرچہ ان مدیران کی یہ جرأت قابلِ اعتراض ہے کہ بغیر حوالے کے اسکو نقل کر لیا۔ اور مجھے اطلاع تک نہیں دی تاہم اس سے افسانہ کی مقبولیت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے، اسکے علاوہ بعض دوسرے افسانے بھی کئی دیگر رسائل میں نقل کیئے گئے ہیں علامہ نیاز کی حد درجہ شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیشہ میری اعانت فرمائی "سکون کی جستجو" کو انھوں نے خاص طور پر پسند کیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ میں نے اس افسانے کے اندر جس اعلیٰ پیرایہ میں تجزیہ نفسی PSYCHO-ANALYSIS کیا ہے ادبِ اردو میں اسکی کوئی مثال ملنی محال ہے۔ "بنگالی ادب" سے متعلق مضمون کو ان اوراق میں شامل کرنا نہیں چاہیئے تھا۔ لیکن چونکہ اس میں ایک خاتون کی افسانوی زندگی کو بے نقاب کیا ہے، نیز اسکی رومانی شاعری کے چند نمونے پیش کیئے ہیں۔ اسلیئے اس مجموعہ میں اسکو جگہ دینا کچھ غیر موزوں نہیں ہے۔ ثمر بالا دہلوی سے مجھے اس قدر محبت ہے کہ اپنے اکثر افسانوں میں عموماً ہیروئن کا نام یہی تجویز کرتی ہوں۔ "نصف ایکٹ کا ڈرامہ" ایک ہلکا سا طنز ہے ان حاملانِ ادب کی طرزِ نگارش پر جو ایک ایکٹ کے ڈرامے اتنے مختصر لکھتے ہیں کہ اگر انکو تمثیل کیا جائے تو مشکل سے پانچ منٹ درکار ہونگے۔ اور اس طرح ڈرامہ کا مقصد خبط کر کے اپنی حماقت کا ثبوت دیتے ہیں۔

اکثر اصحاب جن کو میرے افسانے پسند ہیں خطوط کے ذریعہ میری شخصیت کے متعلق استفسار کرتے ہیں۔ مگر میں مفصل حالات قلمبند کرنے سے اجتناب کرتی رہی، اور یہی مناسب بھی تھا۔ کیونکہ میری زندگی بجائے خود ایک افسانہ ہے۔ اس وقت مختصراً صرف اتنا عرض کرونگی کہ ارض بنگال میرا عزیز وطن ہے۔ اور جیسا کہ علامہ نیاز نے لکھا ہے میں نسباً ہندو ہوں۔ زندگی کی ابتدائی منزلیں جس المناک ماحول میں گذاریں۔ اسکے تصور ہی سے انقباضِ روح ہونے لگتا ہے۔ بعدازاں اگر شانتی نکیتن میرے لئے گہوارۂ تربیت نہ بنتا تو نہ مجھے نگارخانۂ ادب میں اپنے نقوش کی نمائش کا موقعہ ملتا۔ اور نہ میری روح مسرت و شادمانی کی فضا میں سانس لیتی۔ فارغ التحصیل ہونے اور منزلِ شباب میں قدم رکھنے کے بعد سب سے پہلا دل جس نے میرے نغمۂ محبت کے جواب میں محبت کا گیت گایا ایک مسلمان دل تھا۔ اور اسی لئے میں ازدواجاً مسلمان ہوں۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد ۱۹۳۱ء میں عہدہ سفارت پر فائز ہوکر جب میرے عزیز شوہر کو ایران جانا پڑا تو میں بھی ساتھ گئی چنانچہ وہاں فارسی اور فرانسیسی کا کافی مطالعہ کرنیکا موقع مل گیا اور اس وقت بھی شاید اسی زرین فضا میں سانس لیتی ہوتی جو صدیاں گذر جانیکے باوجود ابھی تک بادۂ حافظ کی سرمستیوں سے معمور ہے لیکن رفیقِ زندگی کی بے وقت موت نے مجھے واپس وطن بھیج دیا۔ یہی الم حیات مستقل طور پر میرے لئے سوہانِ روح بنا ہوا ہے۔ اگر ادبی انہماک ایک حد تک باعثِ تسکین نہ ہوتا تو یقیناً پیمانۂ زیست کبھی کا چھلک چکا ہوتا۔

دارجلنگ۔

۱۹ر جولائی ۳۵ء

طاہرہ دیوی شیرازی

طاهره دیوی شیرازی

دخترِ کفش دوز

وہ ہنوز اپنے بسترِ استراحت پر دراز تھی —— ایک نیم عریاں عالم میں —— گردن شانے تک کھلی ہوئی تھی۔ اور دونوں شانے نصف سینے تک برہنہ تھے —— لبوں پر مسکراہٹ، آنکھوں میں برقِ تبسم —— نرم مخملی تکیہ میں اس کے سر سے نشیب پیدا ہو گیا تھا۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ شاید کوئی خواب دیکھا ہوگا، وہ کوشش کر رہی تھی کہ اسکی تعبیر معلوم کرے۔ دائیں ہاتھ کی نازک انگلیاں مسہری کے آبنوسی کٹہرے پر مشقِ موسیقی کرنے میں مصروف تھیں۔ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کچھ گنگنا بھی رہی ہے۔ بہت مدہم سُروں میں —— صرف اپنے ہی نفس کو محظوظ کرنے کیلئے۔

گنگنانا کیا ہے؟

جذباتِ جنسی کے ایک ناقابلِ بیان ہیجان کی پُرجوش اور کیفیتِ شباب سے لبریز شعاعوں میں گھر کرتا تاثراتِ قلب کو نہایت لطیف مگر مبہم پیرایہ میں ظاہر کرنے کی کوشش کا اصطلاحی نام۔ عہدِ شباب اور نسائیت —— ناممکن ہے کہ ان دونوں کا اجتماع ایک ہی پیکر میں

ہو جائے اور فضا نغموں سے معمور نہ ہو۔ اُس کا دوسرا ہاتھ عطریت سے لبریز سیاہ بالوں میں چھُپا ہوا تھا۔ اُن بالوں میں جنکی حقیقت کو دُنیا آجتک نہ سمجھ سکی ۔ نہ صرف میں بلکہ کرۂ ارض کا ہر متنفس صحیح طور پہ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ وہ کسی سوختہ جگر شاعر کے قلبِ حزیں کا دُود عنبریں تھا یا کسی بلبل دام در گرفتہ کا ایک یاس آمیز نغمہ متشکل جو اسکے کاسہ سر سے مَس ہو کر پہلے تو منجمد ہوا اور پھر تار تار ہو کر گداز سینے اور بلوری شانوں پر اس طرح منتشر ہونے لگا گویا تخلیق کی ساعتوں سے قبل ہی اس کی قسمت میں اضطرابِ پیہم رقم کر دیا گیا تھا۔

حریری چادر اور وہ بھی شبنمی رنگ کی ——— نہ اتنی دبیز ہو سکتی ہے ۔ اور نہ اس قدر غیر شفاف کہ کسی کے سینے پر پڑ جانیکے بعد مینائے شباب کی خمار آگیں کیفیات کو اپنے اندر مستور کرلے، اس لئے کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ سر سے پاؤں تک تقوے شکنی کی حد تک برہنہ تھی ——— ہاں برہنہ! کیونکہ جالی دار مہین چولی اور مختصر زیر جامہ میں اتنی صلاحیت کہاں سے آسکتی ہے کہ وہ اچھی طرح پردہ پوشی کر سکے، اور خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ اس لباس کا رنگ بھی اس نوعیت کا ہو، کہ بلوری جسم کی نقرئیت کے ساتھ وصل ہو کر اسی میں مدغم ہو جائے، تاہم مسہری کے چاروں طرف پیازی ریشم کے زرکار پردے آویزاں تھے، اس لئے ناممکن تھا کہ انکو اُٹھائے بغیر کسی کی مشتاق نگاہیں اس ہر گز حسن و جمال سے کما حقہ اکتسابِ نور کر سکیں۔

اُس نے جمائی لیتے ہوئے ان لبوں کو وا کیا جنکا خطِ اتصال اس وقت تک ناممکن التعین تھا۔ بازوؤں کو بھی زحمتِ جنبش دی۔ اور کچھ ایسی ادا کیساتھ ان کو اُٹھایا کہ ان کے درمیان پیدا ہونیوالی قوس ہلال عید سے خراج تحسین طلب کرنے لگی۔ اسکی آنکھوں میں ابھی تک خمار باقی تھا کیونکہ اپنی

ANJUMAN-I-TARAQQI-E-URDU

دوسری سالگرہ کا جشن منانے کے سلسلے میں وہ کافی رات گذر جانیکے بعد مصروفِ خواب ہوئی تھی۔ دوسری سالگرہ اس لئے کہ محل کی چاردیواری میں آئے اسکو دو ہی سال گذرے تھے۔ یوں اسکی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ مگر ابتدائی سولہ برس ایک ایسی فضا میں گذرے تھے جہاں فکرِ معاش سے تنگ آکر قلبِ انسانی میں خودکشی کی آرزو پیدا ہو جاتی ہے۔ جشنِ سالگرہ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

قدرت کے بھی نرالے کھیل ہیں۔ وہ زلفیں جو دو سال قبل کبھی شرمندۂ روغنیات بھی نہ ہوئی تھیں۔ مختلف الالوان پھولوں کی نگہت بار آغوش میں آسودگی حاصل کرنے لگیں۔ وہ سر جسکی آرائش کے لئے ایک سفید دھجی بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ زرّین و منوّر تاج سے مزیّن ہونے لگا۔ اس کا وہ جسم جو ہمیشہ پھوس اور خس و خاشاک کے سخت بستر پر لیٹنے کا عادی تھا۔ اس طرح کہ ہر کروٹ کیساتھ دس بیس تنکے بدن میں چبھ جاتے اور اسے خبر تک نہ ہوتی۔ مخمل و کمخواب کے نرم و نازک گدیلوں پر لطفِ خواب حاصل کرنے لگا ۔۔۔ اس طرح کہ اگر اعضاء کی غیر ارادی جنبشوں سے بستر پر ایک سلوٹ بھی پڑ جاتی تو اُسے چین نہ آتا تاوقتیکہ اسے درست و ہموار نہ کر دیتی۔ اس کا معدہ جو مکروہ ایلوں کی مضمحل آنچ پر سکی ہوئی دبیز روٹیوں کو آسانی سے قبول کر لیتا تھا اس قدر نزاکت پسند ہو گیا کہ اگر دودھ کو بھی چبا کر نہ پیا جاتا تو سوءِ ہضمی کی شکایت پیدا ہو جاتی۔ وہ پہلے ایک مفلوک الحال ہستی کی صرف لختِ جگر تھی۔ اور اب ایک صاحبِ ریاست نواب کی منظورِ نظر سے بھی کچھ زیادہ۔ بوسیدہ اور متعفن جھونپڑے میں دیکھے ہوئے خواب کی تعبیر سے قصرِ شاہی کی چاردیواری میں آ کر ملی۔ اسلئے اس کا دماغ تحت الثریٰ سے فلک الافلاک پر پہنچ گیا تھا۔

انگڑائی لیتے وقت اس نے اپنے جسم کو سمیٹتے ہوئے کچھ اس طرح سانس لیا۔ کہ حریری چادر

کے پلّو ایک طرف کھسک گئے۔ اور گُداز سینے کی وہ "عریانیاں" بھی بالکل بے نقاب ہوگئیں جنکو کبھی مستور نہ رکھنے کی نیت سے سرسری طور پر "محرم نشین" کر دیا تھا۔ نور کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی ان مرمریں چڑیوں نے اپنے شبنمی نشیمنوں سے سر نکال لئے جنکا محض ایک جلوۂ بے محابا، صرف ایک گریز پا جھلک زاہدِ خلوت نشین پر خدا جانے کونسی کیفیت طاری کر دیتی ہے جس کے زیرِ اثر تھوڑی دیر کے لئے محراب و منبر سے لیکر تسبیح کے دانوں تک، زہد و اتقا، کی ہر شے رقص کرتی ہوئی اُسکی نگاہ کے سامنے سے گذر جاتی ہے اور ہوش آنے پر اولین فرصت میں وہ یہ سوچنے کیلئے مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا حیاتِ انسانی کا منتہائے مقصود صرف عبادت ہی ہے یا کچھ اور بھی؟ اگر اسوقت وہ اپنا عکس کسی آئینے میں دیکھ لیتی تو ناممکن تھا کہ جوشِ سرمستی سے خود اسکی رگوں میں دوڑنے والا خون شراب بنجاتا

کیا وہ حسین تھی ـــــ؟

یہ ایک احمقانہ سوال ہے۔ اگر وہ حسین نہ ہوتی تو محلوں کی رنگین فضا میں سانس لینے والا نواب سرسوتی ندی کے کنارے ماہی گیروں کی بستی میں جا کر کبھی گوارا نہ کرتا کہ ایک دخترِ کفش دوز کو حاصل کرنے کیلئے اُس کراہیت آمیز ماحول میں رہ کر زندگی کے چار دن بسر کرے۔ اسکے اپنے محل میں علاوہ مہ جبین بیگمات کے سینکڑوں پری تمثال کنیزیں اسکی نفسانی خواہشات کو تسکین دینے کے لئے موجود تھیں۔ اور اس سوال کا جواب کہ "وہ کونسی ادا تھی جس نے نواب کے دل کو موہ لیا؟" صرف نواب ہی دے سکتا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اگر جوانی کیساتھ معصومیت بھی ہو یعنے نشۂ شباب میں چُور ہو جانیکے بعد بھی خود عورت کے دل میں غرورِ شباب پیدا نہ ہو تو اسکی ہر ادا ہلاکت آفرین حد تک دلربا بنجاتی ہے وہ تصنع اور بناوٹ سے قطعی معرا گاؤں کے سادے ماحول میں پل کر جوان ہوئی

ANJUMAN-I-TARAQQI-E-URDU
ALIGARH

تھی اس لئے نہیں جانتی تھی کہ نسوانی اعضا کی ساخت میں چند ہتھیار ایسے بھی پوشیدہ ہوتے ہیں جن کو ساتھ لے کر شہر پناہ کو عبور کئے بغیر قلعہ فتح کر لینا ممکن ہو۔ چنانچہ جب پہلی بار نواب نے اس کی نور منجمد سے تراشی ہوئی کلائی کو زور سے بھینچتے ہوئے ، ظاہری تحکمانہ لہجہ میں کہا "مچھلی پکڑنے کا یہ سامان ساحل تک لیچلو" تو وہ مطلق نہ سمجھ سکی کہ اس جذبۂ فشار کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔

مردانہ جذبات کی تابش نسوانی اثمار خام کو بہت جلد پکا کر رسیلا کر دیتی ہی، محل کی فضا میں آنے سے قبل اس دیہاتی دوشیزہ کے سینہ کے اُبھار کو اتنی سرفرازی بھی نصیب نہ ہوئی تھی کہ گرفت میں لینے سے مٹھی بھر جاتی۔ یا دو چار ہی مرتبہ تبادلۂ صہبا کر لینے کے بعد یہ کیفیت ہو گئی کہ اگر اُن مینائے شباب کا ایک جلوہ مسکر افضائے عالم پر چھا کے فضا میں ممتزج ہو جاتا تو بلا مبالغہ اسرافیل بھی ایکبار جھوم کر اپنا صور سنبھال لیتا۔ اس خیال سے کہ شاید قیامت کے لمحے نزدیک آپہنچے ہیں۔

اس نے سیاہ لانبی زلفوں کو جو منتشر ہو جانے ہی کے لئے سنواری گئی تھیں اپنی مرمریں انگلیوں کے شانے سے درست کیا اور کسی قدر کسمساتے ہوئے کروٹ لی۔ اسکی نظر کے سامنے خوبصورت تاروں کا پنجرہ دریچہ کی محراب میں لٹک رہا تھا جس کے اندر امریکہ کی سب سے زیادہ خوشنما اور نایاب چڑیا کو حبس دوام کی سزا دیگئی تھی ، اس نے مسہری پر لیٹے لیٹے ایک فلسفی کی طرح غور کرنا شروع کر دیا۔ اس نے چڑیا کی زندگی کا موازنہ خود اپنی ہستی سے کیا، کچھ زیادہ فرق نہیں تھا —— دونوں کے لئے بہترین سامان خورد نوش ، بہترین آسائش اور خدمت کیلئے بہترین ملازم موجود تھے۔ رہنے کی چار دیواری بھی دونوں کیلئے نہایت خوشنما اور قابل دید تھی —— مگر آزادی —— اف ! آزادی کا فقدان

تھا محل میں آنے سے قبل دیہات کی سادی فضا میں صبح سے شام تک اس کا شغل حیات ایک غیر معین و بے ترتیب لائحہ عمل کے ماتحت ہوتا تھا کسی دن وہ مچھلیاں پکڑنے ندی کے کنارے چلی جاتی، اور دن بھر جال لئے کنارے پر بیٹھی رہتی، یا کشتی پر سوار ہو کر ساحل سے کچھ دور نکل جاتی، گھاٹ کے قریب گھٹنے ٹیکا کر سطح آب پر جھک جاتی۔ سیلے چپلے ہاتھوں کی اوک سے پانی پینا اس کا معمول تھا۔ وہ خود بانسری بجانے سے ناواقف تھی، لیکن جب گاؤں کے دوسرے لڑکے مچھلیاں پکڑتے وقت سُرود کے چھیڑتے تو وہ مست و بے خود ہو کر پانی میں اُنگلیاں تر کر کے ساحل کے قریب اُگنے والی گھاس پر چھینٹے دینے لگتی۔ گھر کا ایندھن ختم ہونے لگتا تو وہ بانس کی ٹوکری یا ٹین کا تسلہ لے کر مویشیوں کے پیچھے پیچھے جاتی اور صبح سے شام تک اتنا گوبر سمیٹ لیتی کہ اسکے اُپلے کئی ہفتے تک کافی ہو جاتے۔ اگر کسی روز اس کے باپ کی طبیعت خراب ہوتی تو وہ اسکا ہاتھ بٹانے کے لئے کچے سوت کو بٹ دیتی۔ اس نے پُرانی جوتیوں میں معمولی سلائی کرنی بھی سیکھ لی تھی کشتی میں سیر کرنیوالے لوگوں کے بوٹوں پر پالش کرنا خاص طور پر اسی کے ذمہ تھا، اس کا باپ ذات کا ماہی گیر، لیکن پیشے کے لحاظ سے موچی تھا۔

گاؤں میں اسکی بہت سی سہیلیاں تھیں، جن کے ساتھ برسات کا تمام موسم وہ جھولا جھول کر گذارتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر پیا کو یاد کرتی لیکن نہیں جانتی تھی کہ پیا کس کو کہتے ہیں، وہ پریم کی ہنسی بڑے شوق سے سنتی مگر اس جذبہ سے ناواقف تھی۔ کیونکہ پریم کے لفظ سے اس کے کان آشنا تھے، مگر لب ناآشنا، موسم گرما میں تمازتِ آفتاب سے اسکے بوسیدہ کپڑے پسینہ میں تر بتر ہو جاتے، مگر محل میں استعمال ہونے والے روغن و عطریات کے مقابلہ میں پسینہ کی وہ مہک

اسے زیادہ مرغوب تھی۔ وہ کج فہم اور ناقص العقل ہونیکے باوجود اس رمز کو سمجھتی تھی کہ عطر پھولوں سے کشید کیا جاتا ہے اور پسینہ خود انسان کے جسم کا فشردہ ہوتا ہے۔

محل میں اس کو کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی لیکن اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ پانی کے دو گھونٹ بھی پیئے تو کنیز کے ہاتھوں سے اور وہ بھی چاندی کے کٹورے میں۔ اس کی روح تڑپتی تھی اپلوں کی آنچ پر سکی ہوئی جوار کی گدری روٹیوں کیساتھ تیل میں بھنا ہوا سرسوں کا ساگ کھانے کیلئے، اور محل میں اسے مرغ و مزعفر، متنجن و بریانی اور قورمہ پلاؤ ملتا تھا۔ آم اُسے مرغوب تھے مگر اس طرح چوسنا چاہتی تھی کہ رس ان کے اندر سے ٹپک ٹپک کر تمام گرنے کو بھنکا دے، اور وہ خود ندی کے کنارے بیٹھ کر اپنے ہی ہاتھوں اسے دھو کر صاف کرے، محل میں چینی کی خوشنما قابوں کے اندر نہایت پرتکلف طریقے پر لنگڑے، مالدے اور سفیدے کی قاشیں اسکے سامنے آتیں۔ وہ خورد و نوش سے فارغ ہو جاتی تو کنیزیں سلفچی، آفتابہ اور تولیہ لئے آموجود ہوتیں۔ وہ چاہتی تھی کہ جنگلی گلاب توڑتے وقت اس کی انگلی میں کانٹا چبھ جائے محض اس لئے کہ کوئی سہیلی قریب آکر اتنا پوچھ لے کہ "تکلیف زیادہ تو نہیں ہوئی" اور وہ ہنس کر "نہیں" کہدے، برخلاف اسکے محل کی چار دیواری میں سونے سے قبل اس کو اپنی سیج صدہا قسم کے پھولوں سے مزین ملتی۔ اور اسے یہ سن کر افسوس ہوتا کہ ایک بوڑھے مالی نے ان کو چنا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ گرمی کی سہانی راتوں میں نیند کا لطف اسی وقت آسکتا ہے جب مچھر خوب کاٹیں اور انسان بیدار ہو ہو کر سو جائے۔ کیونکہ اس انقطاع تسلسل میں غیر ارادی طور پر علیحدہ ہو جانے والی باہوں کو ایک بار پھر کسی کی گردن میں حمائل ہو جانیکا موقع مل جاتا ہے اور اسکے ساتھ ہی دو مختلف الجنس ہستیوں کا درمیانی بعد بھی قرب میں تبدیل ہو جاتا ہے،

لیکن یہاں مسہری کے ریشمی زرّین پردے ایک جھونکے کو بھی قریب نہ پھٹکنے دیتے۔ اور اسی لئے وہ بیدار نہ ہوتی تا وقتیکہ افق مشرق کی دیوی اپنی نرم و نازک اور زرکار انگلیوں سے بند پپوٹوں کو گدگدا کر غنچۂ نرگس کو شگفتہ نہ کر دیتی۔ یہ ضرور ہے کہ محل میں آنے کے بعد سے اسکی طبیعت کسی قدر نفاست پسند، آرام طلب اور عیش پرست ہو گئی تھی اور نزاکت اس درجہ تجاوز کر گئی تھی کہ حنا ملے جانے کی تکلیف سے ہاتھ لال ہو جاتے تھے مگر اقتضائے فطرت اس کو اس ماحول سے مانوس نہ ہونے دیتا تھا۔

بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نے نواب سے اجازت حاصل کر لی تھی کہ ہمیشہ سالگرہ کے دوسرے دن وہ دیہاتی روایات کو قائم رکھنے کیلئے اپنی سابقہ طرز معاشرت کا اعادہ کیا کریگی۔ چنانچہ آج سالگرہ کا دوسرا دن تھا اور اسی لئے صبح کا سورج زیادہ درخشانی کے ساتھ طلوع ہوا تھا یہ معلوم کرنے کے لئے کہ محل کے شاہانہ ماحول میں گاؤں کی بے تکلف زندگی کے سادہ مناظر کس طرح پیش کئے جاتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر بہت زیادہ مسرور تھی۔ اس قدر مسرور کہ جوش مسرت میں اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا اور اسی نیم عریاں حالت میں ریشمی پردوں کو حقارت سے جھٹکتے ہوئے مسہری سے نیچے اتر آئی، قد آدم شیشے میں اسے اپنا عکس نظر آیا۔ اسکے بعض وہ اعضا بھی دوسر دل کے واسطے جنت نگاہ بنانے کیلئے برہنہ تھے، جنکو وہ خود اپنی آنکھ سے دیکھنا گوارا نہ کرتی تھی اور اس خیال کیسا تھ کہ وہ نواب کے حکم کے مطابق اس کے جذبات میں ہر وقت ایک ہیجان قائم رکھنے کی خاطر نیم عریاں حالت میں رہتی ہے، اس پر شرم و حیا کا پسینہ آگیا۔ اور وہ محجوب و منفعل ہو کر جلدی سے ملحقہ کمرے میں روپوش ہو گئی۔

اس نے سیٹی بجاتے ہوئے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور غیر ارادی طور پر کچھ سوچتا ہوا دریچہ کے قریب پہنچ گیا، اسکی متجسس نظریں صحن چمن میں کسی کو دیکھ لینے کیلئے بیتاب تھیں، اس وقت وہ خود خاص مشرقی طرز کی پوشاک میں ملبوس تھا، لیکن کمرے کا باقی ماحول مغرب کی حیا سوز تہذیب کے زیر اثر عمیق ترین عریانیات کا مخرب الاخلاق مجموعہ تھا، بالکل برہنہ عورتوں کے فوٹو اور تصاویر سے دیواروں کو زینت دیگئی تھی۔ یونانی صنمیات کی روایاتِ قدیم کو مادی شکل میں پیش کرنیوالے مرمریں و بلوری مجسمے طاقوں اور میزوں پر سجے ہوئے تھے جن میں عشق و محبت کے دیوتا حسن و جمال کی دیویوں کیساتھ مصروف اختلاط تھے۔ خلوت کی بعض رنگینیوں کو جو صرف خلوت ہی میں رنگین و لطیف معلوم ہوتی ہیں جلوت میں کچھ اس قدر عریاں طریقہ پر پیش کیا گیا تھا کہ ان کا عملی پہلو اختیار کیا جائے یا نہ کیا جائے لیکن نفس انسانی پر اس کیفیت کا طاری ہو جانا یقینی تھا۔ گویا وہ تراشے ہوئے لیموں تھے۔ جنکو زبان سے چکھے بغیر کام و دہن انکی ترشی سے لذت یاب ہونے لگتے تھے۔ فرش پر بچھے ہوئے قالین بھی عریانی کے بے مثل نمونے تھے۔ مثلاً ایک قالین پر دکھایا گیا تھا کہ زہرہ بام فلک پر آسودۂ خواب ہے، اس طرح کہ عالم رؤیا میں کسی سے ہم آغوش ہو جانے کی کشمکش میں وہ تمام اعضائے حسن برہنہ ہو گئے تھے جنکو صرف ایک نظر دیکھ لینے سے عابد تہجد گذار کو بھی دوبارہ غسل و وضو کی حاجت لاحق ہو سکتی ہے، ایک کونے میں کیوپڈ کو دکھایا گیا تھا۔ جو کمان کا چلّہ چڑھائے یہ سوچ رہا تھا کہ تیر کس ڈھب سے چلایا جائے کہ زہرہ کا دل نشانہ بن سکے۔ اسی کے پس منظر میں صبح کی دیوی آرورا ایک عالم بیخودی میں جلوہ فگن تھی ہمسہری کے ریشمی پردوں پر بھی زرکار نقاشی پیش کیگئی تھی، اس کا وہ حصہ جو بستر پر دروازے ہو جانیکے بعد نظر کے سامنے رہتا ہی خاص طور پر قابل دید تھا۔

کہا جا سکتا ہو کہ اس کا وہ تقوئے شکن منظر کوک شاستر کے تمام مصور صفحات پر سبقت لے گیا تھا مختصر یہ کہ اس فضائے شباب میں چمکنے والا ہر ستارہ اس قدر ہیجان انگیز اور مستی میں ڈوبا ہوا تھا کہ ایک عصمت مآب دوشیزہ بھی ان جلوؤں میں گھر جانیکے بعد تھوڑی دیر کیلئے اپنی نسائیت کو خیرباد کہہ کر لڑکی سے عورت بنجانے کیلئے مجبور ہو جاتی۔

نواب ابھی اپنے خیالات ہی میں محو تھا کہ دروازے پر لٹکنے والے پردے میں جھنکار پیدا ہوئی کیونکہ اسے بلور کی مختلف مچھلیوں اور موتیوں کو منسلک کر کے تیار کیا گیا تھا، اور اسکے ساتھ ہی نسوانی قدموں کی ہلکی چاپ نے مدھم سُروں کا نغمہ منتشر کر دیا۔ ایک کنیز اندر داخل ہوئی لیکن کچھ اس ادا کیساتھ کہ یہ معلوم ہوا گویا طاق میں رکھی ہوئی کسی چینی کی مورت میں جان پڑ جانے کے باعث حرکت پذیری کی قوت پیدا ہو گئی ہے، وہ بھی سر سے کمر تک سوائے دو مقامات کے بالکل برہنہ تھی، اور اگر اس وقت بجائے دن کے رات ہوتی تو شاید انہیں بھی عریاں کر دیا جاتا۔ روز روشن میں ان کو محض اس لئے مستور رکھا جاتا ہے مبادا درختوں کی ڈالیوں پر چھپا ہوا لے طوطوں میں سے کسی کی نگاہ پڑ جائے اور وہ ان کو کُتر لینے کیلئے آمادہ ہو جائے کیونکہ ایک نوخیز لڑکی کی ملکیت میں کچھ ایسی چیزیں بھی دیکھنے میں آئی ہیں جن پر سیب اور رنگترہ کا دھوکا ہو جاتا ہے ——— سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ تھالی میں رکھکر جام شراب کیوں لائی تھی۔ جب کہ خود اسکی آنکھیں مینا بدوش تھیں۔

نواب نے کوئی لفظ کہے بغیر اُس آتش سیال سے اپنی تشنگی بجھائی، تاہم لبوں کی تردامنی کو خشک کرنے کیلئے کنیز کے سرخ اطلسی رخسار سے صاف کر لیا، وہ لجاتے ہوئے آداب بجا لائی، اور جلدی سے اس طرح چلی گئی گویا آئی ہی نہیں تھی۔

نواب کو پل پل کی خبر مل رہی تھی۔ کنیزیں آتی تھیں اور کہہ جاتی تھیں کہ اب محل کی چاردیواری میں دیہاتی طرز زندگی کا کونسا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اُنہوں نے بتایا کہ بستر سے اُٹھنے کے بعد بیگم سب سے پہلے اس تالاب پر گئی جس میں شوقین مزاج نواب نے پانی کے مختلف جانور پال رکھے تھے۔ رنگ برنگ کی خوبصورت مچھلیاں، راج ہنس، مرغابیاں، قازیں، بطخیں اور خدا جانے کیا کیا۔ اس نے عنبریں بالوں کی عطریت، رخساروں پر ملے ہوئے غازہ کی خوشبو، پھولوں کے گجروں میں بسی ہوئی مرمریں گردن کی مہک، لب لعلیں پر جمی ہوئی مستی کی دھڑی، نرگسی آنکھوں میں تڑپنے والی سرمہ دنبالہ دار کی ہلکی سی لہر، صندل بھری مانگ کی گلنار رنگینی، مصنوعی خال کی شرمگیں ملاحت، اور غرض یہ کہ ہر وہ چیز جس سے تزئین جمال ہوئی تھی ملتانی مٹی اور ایسی قسم کی دوسروں چیزوں کے ذریعہ ارادتاً دور کر دیا۔ گدلے بکروہ پانی میں جس کی غلاظت فضا کو بھی متعفن کئے دیتی تھی اس نے غسل کیا، وہ خود ایک بنت البحر بن کر جل پریوں کیساتھ کھیلنے لگی، اس نے مچھلیوں کو پکڑا اور چھوڑ دیا، کبھی راج ہنس کو سر پر بٹھا لیتی اور کبھی مرغابی کو شانہ پر جگہ دیتی۔ اسکے مست قہقہوں سے تمام فضا معمور تھی۔ اس نے پانی کے چھینٹے دے دیکر قازوں کو ستایا اور خوب دل لگی کرتی رہی، پھر تالاب سے ملحق جھاڑیوں کے کنج عزلت میں چھپ کر اس نے کھدر اور گاڑھے کا لباس پہنا، خود رو پودوں سے ہر قسم کے پھول توڑے اور ہار بنا کر گلے میں ڈال لیا۔ اب اسکی کلائیوں میں بجائے طلائی پہنچیوں اور منقش کنگنوں کے صرف کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ اس نے دیسی چمڑے کا گنواری جوتا پہنا، اور پانی کا گھڑا سر پر رکھکر چل پڑی۔ اپنے شاہی کمرے کی طرف نہیں ایک دربان کے جھونپڑے کی جانب جسکو عارضی طور پر خالی کرالیا تھا۔ وہاں جاکر وہ چکی میں جوار پیسنے بیٹھ گئی۔ اور اس انہماک میں خدا جانے

کیا گاتی رہی۔

اُپلوں کی آنچ پر تین چار گدری روٹیاں پکائیں جب کہ اس دوران میں پالک کا ساگ سرسوں کے تیل میں الگ بھنتا رہا۔ اس نے کھانا کھا کر مٹی کے آبخورے سے پانی پیا، اور تنکوں کے سخت بستر پر تھوڑی دیر کے لئے لیٹ گئی! اپنے ماں باپ، بھائی بہن، اپنی سکھیوں، اپنی بھینسوں اور گاؤں میں پلے ہوئے کتوں کو یاد کر کے اس نے رونا شروع کر دیا، اور اسکے آنسو آنچل میں جذب ہوتے چلے گئے۔

نواب کو جب ان باتوں کی خبر ملتی تو وہ دل ہی دل میں افسردہ ہوتا۔ وہ پشیمان ہو رہا تھا، کہ ایک دیہاتی لڑکی کو محل میں لا کر کیوں رکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ خود اپنی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ ٹاٹ کا پیوند ٹاٹ ہی میں اچھا رہتا ہے، گندے پانی میں پرورش پانے والی مچھلی صاف ستھرے آبِ زمزم میں زندہ نہیں رہ سکتی، کتے کو گھی ہضم نہیں ہوتا، سرسوتی ندی کے کنارے اس حسین دوشیزہ کو دیکھ کر اس نے خیال کیا تھا کہ یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ گدڑی میں لعل کو چھپا کر رکھ دیا۔ درآنحالیکہ وہ طلائی زنجیر میں منسلک ہو کر گلے کا ہار بنجانے کے قابل ہے۔ اس کو اپنے محل میں لا کر وہ خوش ہوا تھا کہ قدرت کی ایک زبردست غلطی پر تصحیح کر دی ہے یہ قدرت کی کج فہمی تھی کہ وہ خوب و زشت میں امتیاز نہ کر سکی۔ اسے یہ معلوم نہ ہوا کہ کونسی چیز کس جگہ کے لائق ہے لیکن تلخ تجربہ حاصل کرنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ خود اس سے ایک حماقت سرزد ہو گئی ہے! اب وہ سمجھا کہ انگارے جو یاقوت کی طرح چمکتے ہیں دراصل یاقوت نہیں ہوتے۔ اور یہ کہ خوبصورت خوشنما سانپوں میں زہریلا مادہ ہوتا ہے! اس نے خیال کیا تھا کہ محل کی رنگین فضا میں اس دیہاتی لڑکی کو چار چاند لگ جائیں گے۔ یہ

درست نکلا لیکن اسکی چند عادتوں میں تبدیلی واقع ہوئی فطرت یکسر نہ بدل سکی اور آخر کار ثابت ہو گیا کہ شیر کا بچہ انسان کی گود میں پل جانیکے بعد انسان سے کتنا ہی مانوس کیوں نہ ہو جائے اپنی بہیمانہ خصلت کو نہیں چھوڑ سکتا۔

وہ تصورات کی دنیا میں واقعاتِ گذشتہ کا مطالعہ کرنے لگا۔ وہ ایک روز اپنے مصاحبوں کے ساتھ مچھلی کا شکار کھیلنے گیا تھا۔ سرسوتی ندی کے کنارے اسے کشتی میں ایک نوخیز لڑکی نظر آئی، پھٹے پرانے بوسیدہ کپڑوں میں وہ ایسی معلوم ہوتی تھی، گویا سیاہ بدلیوں میں سے چاند جھانک رہا ہے۔ اس نے چار روز کیلئے لڑکی کو اپنی خدمت پر مامور کر لیا۔ لیکن وہ پھولوں کو صرف آنکھ سے دیکھ لینے کا قائل نہیں تھا گلچینی کی آرزو بھی دل میں پیدا ہو گئی۔ چنانچہ چلتے وقت اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ غالباً بڈھا باپ اس ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا مگر پانچسو روپے کی کثیر رقم نے اسکی زبان بند کر دی، دولت ناممکن باتوں کو بھی ممکن کر دکھاتی ہے۔

دخترِ کفش دوز جب شاہی محل میں آئی تو کئی روز تک ہر شئے کو تعجب کی نگاہوں سے تکتی رہی، عرصہ تک اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ کپڑوں کے اندر سورج کی کرنوں جیسی چمک کس طرح پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس قدر ہلکے اور مہین کیوں ہوتے ہیں کہ پورے تھان کو مٹھی میں لے لینا ممکن ہے۔ وہ صرف پکی اینٹ سے پاؤں مانجھنے کی عادی تھی، کنیزوں نے اسفنج کے ٹکڑے اور ربڑ کے جھانوے دیئے تو حیران رہ گئی کہ یہ کس لئے ہیں۔ اور اگر بروقت اسے منع نہ کر دیا جاتا تو شاید وہ گلگونہ یا غازہ کی ایک انگلی بھر کر منہ میں رکھ لیتی، یہ سمجھ کر کہ یہ بھی کوئی کھانے کی شئے ہے، اس نے صرف بانسری کے نغمے سنے تھے، ہارمونیم، ستار اور رباب سے اسکے کان ناآشنا تھے۔ ناچ کا مفہوم اسکے ذہن میں صرف اسقدر

تھاکہ کچھ عورتیں ایک حلقہ میں کھڑی ہوکر اور گھونگٹ نکال کر اپنے جسم کو ایک مخصوص طریقہ پر جنبش دیں، کبھی انکا سر آگے کیطرف جھکے۔ اور کبھی پشت کیجانب بعض دفعہ پاؤں زمین پر زور سے مارا جائے اور بعض دفعہ ہلکا۔ محل کی بزم نشاط میں اس نے دیکھا کہ صرف ایک نوجوان عورت مجمع کے سامنے اس طرح رقص کرتی ہے کہ اکثر اس کا سینہ کمر تک اور ٹانگیں بالائی سرے تک برہنہ ہوتی ہیں۔ وہ بے حیائی کے اس منظر کو دیکھ کر ابتداء میں خود شرما جاتی تھی، وہ بمشکل سمجھ سکی کہ آخر ناچ میں اس چیز پر کیوں زور دیا جاتا ہے کہ چھاتیاں اور کولھے بھی اپنی اپنی جگہ رقص کریں آنکھیں مٹکیں اور رخسار تھرکیں مختلف قسم کے ہنرت دیکھکر اس نے خیال کیا کہ غالباً رقاصہ ہوا کے سمندر میں تیرنے کی کوشش کر رہی ہے اسکے دیہاتی گیتوں میں کوئی لفظ ایسا نہیں تھا جو جذبات میں ہیجان پیدا کرکے انسان کو گناہ کی ترغیب دے، برخلاف اسکے یہاں شعر کا ہر مصرع بذاتِ خود ایک فرمعصیت تھا،

نواب اپنے خیالات میں محو تھا اور ابھی کسی نتیجہ پر نہ پہنچا تھا کہ آئندہ اس دیہاتی لڑکی کیساتھ کس قسم کا طرزِ عمل اختیار کیا جائے کہ اسے اطلاع ملی کہ ہر ہائینس گوبر کا ڈھیر سامنے رکھے اپلے تھاپ رہی ہیں۔ آتشِ غضب اسکے سینے میں بھڑک اُٹھی، اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب اس کم نصیب چمارن کو محل کی چار دیواری سے نکال دیا جائے۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور دربان کے جھونپڑے کیطرف چل دیا۔

قریب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ محل میں رہنے والی بیگم نے گاڑھے کا لباس زیب تن کر رکھا ہے، آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی ہیں، اور دونوں کلائیاں نجاست سے آلودہ ہیں۔ اسے آتا دیکھکر

وہ کھڑی ہوگئی اور کسیقدر جھک کر بولی "آیئے! بابوجی!......"

اس نے سنا تھا کہ امیر آدمیوں سے "بابوجی" کہکر بات کرتے ہیں۔ اور اسی لئے گاؤں کا ہر شخص تحصیلدار کو "بڑے بابو" اور نائب تحصیلدار کو "چھوٹے بابو" کہکر مخاطب کیا کرتا تھا۔ اگرچہ وہ کنیزوں کی زبان سے نواب کی شان میں بڑے بڑے القاب سن چکی تھی اور خود بھی اُن ذی وقار لفظوں سے اسکو یاد کر چکی تھی، مگر دیہاتی معاشرت کا خیال کر کے اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ نواب کو بھی بابوجی ہی کہا جائے۔

اپنے ہی جملے پر جو خود اسکے خیال کے مطابق بالکل انوکھا تھا وہ مسکرائی اور یہانتک مسکرائی کہ کھِل کھِلا کر ہنسنے لگی۔ ایک عورت اور خاص طور پر فضائے شباب میں سانس لینے والی عورت کا تبسم جب بڑھتے بڑھتے دلفریب مگر مدہم قہقہے کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو بلا مبالغہ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا ساغر و مینا کے باہم ٹکرانے سے جلترنگ کی ایک خاص نوع کا نغمہ پیدا ہو رہا ہے جس کے ترنم میں قلقلِ مینا کا بھی تھوڑا سا حصّہ شامل ہے۔

"بابوجی" اس نے مسکراتے ہوئے دوبارہ کہا "ہم نے تمہارے جوتوں کو صاف کر کے چمکا دیا ہے۔ اپنے نوکر کو بھیج کر منگا لو۔"

نواب نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ جھونپڑے کی دیوار کیساتھ پانچ سات جوڑے جوتیوں کے رکھے تھے۔ اسکی تیوری پر بل پڑ گئے۔ یہ اس کی شانِ امارت کی زبردست توہین تھی کہ ایک عورت جو اسکی زینت آغوش بن چکی ہے ایسے ذلیل کام کرے۔ مگر کیا کہہ سکتا تھا۔ حماقت اپنی ہی تھی۔

اس نے انتہائی ضبط سے کام لیکر چند طلائی سکّے اپنی جیب سے نکالے۔ اور محل میں بیگم

بن کر رہنے والی دختر کفش دوز کے سامنے زمین پر ڈال دئے۔ پھر کہا:-

"یہ چھتیاں صاف کرنے کی اُجرت ہے۔ اسے اُٹھا لو۔ اور ہمیشہ کے لئے اس ریاست کی حدود سے باہر نکل جاؤ۔ تم امیرانہ زندگی بسر کرنے کی اہل نہیں ہو۔ تم کو اجازت ہے اپنے گاؤں میں ماں باپ کے پاس واپس جا سکتی ہو۔ شاہی خزانہ سے ہر ماہ تمہاری مالی امداد ہوتی رہیگی"

آسمان سے ٹوٹے ہوئے ایک تارے کیطرح جس کو یکایک نور و ضیا سے محروم کر دیا گیا ہو' وہ حیران و ششدر ایک عجیب اضطراری کیفیت کے ماتحت کھڑی کی کھڑی رہگئی۔ اور یہ سوچنے لگی کہ جو کچھ سُنا وہ فریب سماعت تو نہیں ہے۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ جاہ و ثروت کی دُنیا میں ایسا ہو سکتا ہے کہ صنف نازک کے جسم سے دو سال تک لطف اندوز ہونیکے بعد ہار کے باسی پھولوں کی طرح اسے بھی ٹھکرا دیا جائے یہ مانا کہ وہ اپنی نزاکت و رعنائی کے لحاظ سے پھول کی مانند ہے۔ اس کا حسن ماہ تاباں کیطرح سریع الزوال ہے ——— لیکن اس کے جذبات قلب؟ ———

اس کا چہرہ شدتِ غیظ و غضب سے سُرخ ہو گیا انتہائی غصّے کے باعث اس کا تمام بدن کپکپانے لگا۔ تیوری کے بل بتا رہے تھے کہ وہ دُنیا کو فنا کر دینے کی قوت اپنے اندر بیدار کر رہی ہے۔ وہ نواب کی طرف بڑھی کچھ ایسے انداز سے گویا اُسے اُٹھا کر زمین پر پٹک دیگی۔ اور اگر اس طرح بھی آتش انتقام سرد نہ ہوئی تو اُسے ٹھکرا دیگی کچل دیگی۔ پامال کر دیگی لیکن اچانک پیدا ہو جانیوالے کسی خیال سے وہ جھجک کر رہ گئی اور جس طرح تند و تیز آندھی کے خاتمہ پر اکثر مینہہ برسنے لگتا ہے اسکی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

آہ! بیکس عورت کی مجبوریاں صرف قطرہ ہائے اشک کے سوگوار دامن میں پناہ لیتی ہیں۔

سنجوگ!

سُر بالا مالن کی بیٹی جھونپڑوں میں پلی تھی۔ اُس نے کبھی محلوں کا خواب بھی نہ دیکھا تھا، وہ نہیں جانتی تھی کہ پھولوں کی سیج پر سوتے میں کیا مزہ آتا ہے، وہ سمجھ ہی نہیں سکتی تھی کہ گلے میں پھولوں کے گجرے سے کس قسم کا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ حالانکہ دوسروں کی سیجوں کے لئے پھول توڑنا اور دوسروں کے گلے کیلئے گجرے تیار کرنا اسکی زندگی کا واحد مقصد تھا، غنچہ و گل کی نکہت و صباحت میں اُس نے اپنی زندگی کے سترہ سال گذار دیے تھے اور گذشتہ دس سال میں اُس نے جتنے کنٹھے گوندھے غالباً ان کا شمار بھی مشکل تھا، یقیناً اُسکے ہاتھوں توڑے ہوئے پھولوں کی تعداد رات کو آسمان پر چمکنے والے ستاروں کی تعداد سے بڑھ گئی ہوگی، لیکن اُس نے اپنی ذات کے لئے کبھی ایک ہار بھی بنانے کی جرأت نہ کی، مرجھائے ہوئے پھولوں تک کو سونگھنا اسکے لئے حرام تھا کیونکہ وہ کنواری تھی۔ ابھی اس کا بیاہ نہیں ہوا تھا، اس لئے سہاگ کی رات آنے سے قبل، پُرانے لوگوں کی بتائی ہوئی رسوم کے مطابق اپنے آپ کو تمام عمدہ چیزوں سے محروم رکھنا اسکا فرض تھا تاہم وہ پھولوں کی خوشبو سے ناواقف نہیں تھی۔ کیونکہ روزانہ جب باغیچے میں جاتی تو ہوا کے خوشگوار جھونکوں میں

ملی ہوئی پھولوں کی مہک از خود ناک میں پہنچکر مشام جان پہنچاتی تھی۔ گویا وہ آسمانی ستاروں کی چمکدار گیندوں کو صرف دور سے دیکھتی تھی، ان سے کھیلتی نہیں تھی۔

علی الصبح چمن میں جانا اُس کا معمول تھا، وہ رات بھر میں کھلے ہوئے ہر قسم کے تمام پھول توڑ لیتی، کچھ گجروں کے لئے، کچھ گلدستوں کیلئے، کچھ منتشر حالت میں فروخت کرنے کے لئے۔ چمن سے واپس آکر وہ اپنے اور باپ کے لئے کھانا تیار کرتی کیونکہ ماں مر چکی تھی اور دائی رکھنے کا مقدور نہیں تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ سوئی تاگہ لیکر بیٹھ جاتی اور سہ پہر تک پھولوں کی ترتیب میں محو رہتی، شام ہونے ہی اس سامانِ تزئین کو ٹوکری میں لگا کر وہ چوک چلی جاتی اور شاید ہی کوئی دن ایسا منحوس ہوتا ہوگا کہ اُس کا سب سامان فروخت نہ ہوتا ہو۔ بھلا کس طرح ممکن تھا کہ وہ اپنے سُریلے ترنم میں پھولوں کی آواز لگائے اور جانے والوں کی توجہ اسکی طرف مبذول نہ ہو، بعض لوگ تو صرف اسلئے پھول خرید لیا کرتے تھے کہ بیچنے والی ایک عورت ہے۔ اور وہ بھی نو شگفتہ غنچے کیطرح نوخیز۔ نسائیت میں یوں ہی کیا کم جاذبیت ہوتی ہے، کہ عالمِ شباب سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے، ان کیفیات میں ایک ہی بار جلوۂ نمائی سے کچھ دیر کیلئے سنگین بُت میں بھی ہم آغوشی کی آرزو پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ بھی چاہتا ہے کہ اپنے پجاری کے قدموں میں گر کر پاؤں چوم لوں۔

چوک سے واپس آکر وہ پھر دوزخِ شکم کی آسودگی کیلئے کھانا تیار کرنے میں مشغول ہو جاتی۔ اکثر وہ سوچا کرتی کہ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ چکی کے بیل کیطرح ایک ہی دائرے میں گھوما جائے اور کبھی کوئی تبدیلی نہ ہو، وہ سونے کے لئے لیٹتی تو ٹوٹی ہوئی چارپائی پر عمدہ بستر کبھی نہ ہوتا تھا تاہم اُسے جلدی ہی نیند آجاتی تھی، کیونکہ غیر ارادی طور پر پھولوں میں بسے ہوئے دامن اس کے دماغ کو معطر

کر دیا کرنے تھے غنچوں کی نکہت میں رہتے رہتے وہ خود ایک غنچہ بن گئی تھی۔ لیکن گل چین کے دستبرد سے محفوظ۔

(۲)

ایک روز شام کیوقت وہ حسبِ معمول پھول بیچنے گئی۔ اُس دن بانو مانگ ہی زیادہ تھی یا خود اُسکے اُترے ہوئے چہرے کی بڑھی ہوئی رعنائیوں نے لوگوں کو گرویدہ کر لیا۔ بہرحال خلافِ توقع سب سامان بہت جلد فروخت ہو گیا صرف ایک مختصر سا ہار باقی تھا۔ اُس نے خیال کیا کہ ایک گاہک کی انتظار میں وقت گنوانا اچھا نہیں۔ آج کی اُجرت بھی روز کی نسبت زیادہ ہو گئی ہے، بہتر ہے کہ یہ بچا ہوا کنٹھا مندر میں جا کر دیوی کے گلے میں ڈالدوں۔ پوجا کئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں وہ جلدی ہی اس فیصلہ پر پہنچ گئی۔ لہٰذا دیوی کے چرنوں میں خراج پیش کرنے کی نیت سے چوک کے شور و غوغا کو چھوڑ کر اُس نے پُر سکوت مندر کی راہ لی۔

ابھی وہ راستہ ہی میں تھی کہ ایک شخص نے اُسے ٹوکا۔ سُربالا اُسے جانتی تھی۔ وہ غیر تھا، مگر اپنوں سے زیادہ۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ دونوں بچپن میں ساتھ کھیلے تھے۔ ایک ہی باغیچہ میں، ایک ہی فضا میں۔ منوہر ٹھیکیدار کا لڑکا تھا امیر تھا، اُسے بھی سُربالا سے محبت تھی لیکن اُس نے شادی کرنےسے انکار کر دیا تھا۔ وہ اس بات کو اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا کہ ایک مالن کی لڑکی کو شریکِ حیات بنایا جائے۔ وہ رسم و رواج کے مطابق رشتہ جوڑے بغیر اُسے اپنا بنا لینے کا آرزو مند تھا لیکن سُربالا اسے کیوں گوارا کرتی، وہ جانتی تھی کہ ایک دفعہ لغزش ہو جانے کے بعد زندگی ہمیشہ کے لئے لائقِ نفریں ہو جائیگی۔ کچھ عرصہ ہوا منوہر کی شادی ہو چکی تھی۔ سُربالا

کو اس حقیقت کا علم تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا ایسی باتیں پوشیدہ نہیں رہ سکتیں۔ اسلئے اگر منوہر صرف اپنی ذات کیلئے ہار کی فرمائش کرتا تو وہ کبھی دریغ نہ کرتی۔ بلکہ اگر پھول نہ ہوتے تو اسی وقت چمن میں گلچینی کیلئے جاتی۔ اور پھول کھلے ہوئے نہ ہوتے تو وہ اپنے قلب کی تپش سے، اپنے تنفس کے جھونکوں سے اپنے آنسوؤں کی طراوت سے اور سب سے زیادہ اپنے حسن کی گرمی سے ان کو قبل از وقت شگفتہ کر دیتی یا آسمان پر چمکنے والے ستاروں کو نوچ لیتی۔ یا اپنی رگوں میں دوڑنے والے خون کو منجمد کرتی اور اور گلاب کی پتیوں کی شکل میں کاٹ کر تاگے میں پرو لیتی۔ وہ کبھی گوارا نہ کرتی کہ منوہر کا دل میلا ہو، اُسے رنج پہنچے۔ لیکن اب جانتی تھی کہ وہ پھولوں کا ہار کس ہستی کیلئے طلب کر رہا ہے۔ آتش رقابت اُسکے سینہ میں بھڑک اٹھی، اُس نے تہیہ کر لیا کہ پھولوں کو مسل کر پھینک دونگی، لیکن اس کو نہیں دونگی، اُس نے صاف انکار کر دیا، وجہ بھی معقول تھی اس نے کہا:۔

"میں نیت کر چکی ہوں کہ یہ ہار دیوی کے گلے میں پہناؤنگی، اس لئے مجبور ہوں، تمہیں نہیں دے سکتی، کسی اور جگہ سے لے لو۔"

منوہر نے کہا "مُربالا تمہیں ہار دینا ہوگا۔ میں بھی اپنی دیوی ہی کیلئے مانگ رہا ہوں، میری دیوی تمہاری دیوی سے زیادہ سُندر ہے۔"

ان الفاظ سے اُسکے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے زندگی میں پہلی بار منوہر کو نام لیکر مخاطب کیا۔

"منوہر اپنی دیوی کے گلے میں جو تمہارا ہار پہنا دو، اُس سے کہنا پھول بکنے بند ہو گئے چمن میں خزاں آگئی۔" یہ کہکر اُس نے منوہر کا ہاتھ جھٹک دیا اور بظاہر مسکراتی ہوئی چل پڑی لیکن چند

ہی قدم کے بعد اپنے دامن میں آنسو جذب کرنے کی خاطر رُکنا پڑا۔

(۳)

وہ مندر کے دروازے پر پہنچی۔ اندر داخل ہوئی، اور بادلِ ناخواستہ ہار دیوی کے گلے میں ڈال دیا۔ اُس نے پوری طرح پوجا کی رسم بھی ادا نہیں کی۔ اس کا دل تو آنسو بہانے کے لئے بیتاب تھا۔ وہ جلدی ہی باہر آ کر گھر چلی گئی۔

اُس نے صبح کی بچی ہوئی باسی روٹی اپنے باپ کو کھلا دی، خود کچھ نہ کھایا، باپ کے پوچھنے پر بہانہ کر دیا کہ میری طبیعت خراب ہے، سر میں درد ہو رہا ہے ایک یہی عذر ایسا ہے جس کو سننے والے جلدی تسلیم کر لیتے ہیں، کیونکہ کسی قسم کا درد دکھائی نہیں دیتا۔

وہ سونے کیلئے چارپائی پر لیٹی تو برابر روتی رہی۔ کسی کروٹ چین نہیں آتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے منوہر کی بے وفائی پر اسقدر آنسو بہائے۔ اُس کا دل بھرا چلا آتا تھا۔ وہ چپکے چپکے رو رہی تھی کہ کہیں باپ کو خبر نہ ہو جائے، کئی بار بے اختیاری کے عالم میں چیخ نکل جانے کے قریب تھی کہ اس نے ضبط سے کام لے کر اُسے روک لیا۔ لیکن متلاطم سمندر کی طغیانی کہیں لکڑی کا بند لگانے سے روکی جا سکتی ہے، ایک زبردست سیلاب گریہ تھا جو اُسے جھونپڑی سے بہا کر ایک ایسے ساحل پر لے جانا چاہتا تھا۔ جہاں سہارا دینے کیلئے منوہر کا ہاتھ ہو، اسکے رُبابِ حیات میں ترنم ریزیاں بیدار ہو رہی تھیں۔ زندگی کے تاروں میں لرزش تھی، کائنات کا ہر ذرہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ جب تک وہ ناشنیدہ نغمے جوابِ تک بیرونِ ساز نہیں ہوئے فضا میں منتشر نہیں ہونگے۔ تجھے کامل سکون نصیب نہیں ہو سکتا، اُسکے اضطراب میں اضافہ ہوتا گیا۔ بیقراریاں بڑھتی

گئیں، اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اندر ہی اندر دل کو مسوس رہا ہے۔

وہ پشیمان تھی کہ اُس نے منوہر کو ہار کیوں نہ دے دیا۔ فرمائش کرنے والا تو دہی تھا۔ اس سے کیا غرض کہ وہ کس کے لئے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے کبھی کسی گاہک سے نہیں پوچھا تھا کہ تم پھول کیوں خرید رہے ہو، وہ جانتی تھی کہ ان کا مصرف مختلف ہے۔ کوئی قبر پر چڑھاتا ہے تو کوئی مندر میں دیوی کے سامنے پیش کرتا ہے، کوئی دوا بنانے کیلئے آگ پر رکھتا ہے، اور کوئی لطف خواب حاصل کرنے کیلئے سیج پر بچھاتا ہے۔ کاش آج اُسکے دل میں پوجا کا خیال پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔ وہ منوہر کو بالکل اجنبی سمجھتی اور ہار اُسکے ہاتھ فروخت کر دیتی۔ ہاں سب سے زیادہ یہ کہ باغیچہ میں کوئی پھول نہ کھلا ہوتا، تو بہتر تھا۔ وہ گھر سے نہ نکلتی، باہر ہی نہ جاتی، منوہر اُسے نہ ملتا، لیکن جو ہونا تھا سو ہو چکا۔

جوشِ اضطراب سے اسکے دلمیں ایسے خیالات پیدا ہونے لگے جو انسان کو لامذہب اور بیدین کر دیتے ہیں۔ اُس نے سوچا کہ پتھر کی بے جان دیوی پر پھول چڑھانا بالکل حماقت ہے جب کہ اُس میں احساس کا مادہ ہوتا ہی نہیں، اسکے چہرے پر ناک ہوتی ہے، مگر سونگھنے کی قوت نہیں۔ لہذا چنبیلی کی کلیاں ہوں یا دھتورے کے پھول اسکے لئے سب یکساں ہیں۔ اور پھر اس کو جاندار انسان سے زیادہ رتبہ کیوں دیا جائے۔ کسی تصویر کے نقوش ——— جو نتیجہ ہیں مصور کی رعنائی خیال کا۔ کبھی اپنے نقاش سے زیادہ فضیلت حاصل نہیں کر سکتے۔ لہذا مندر میں پوجا پاٹ سب لغو چیز ہے انسان کو انسان ہی کی عبادت کرنی چاہیئے۔

اُس نے ایک فلسفی کی طرح یہ بھی سوچا کہ اگر منوہر بے وفا ہے تو ہوا کرے۔ میں اُس جیسی کیوں

بنوں۔ چاند سورج چھپنے کے بعد دوبارہ نکل آتے ہیں۔ ممکن ہے، منوہر کا پھرا ہوا دل بھی کچھ عرصہ بعد میری طرف مائل ہو جائے۔ ہائے افسوس! گل چینی کرتے زمانہ گذر گیا، میری آنکھوں نے خزاں کے بعد بہار دیکھی، مگر اس سے کوئی سبق حاصل نہ کیا۔

:(۴):

اس کا اضطراب بڑھتا گیا، حتیٰ کہ اُس نے محسوس کر لیا کہ اگر اس احمقانہ غلطی کا ردِ عمل نہ کیا گیا تو زندگی یقیناً دوبھر ہو جائیگی، اور صبح پکڑنی مشکل ہو جائیگی۔ لہٰذا وہ چارپائی سے اٹھی لیکن اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، سانس روکے ہوئے، آہستہ قدم، دامن کو نہایت احتیاط سے اُٹھا کر مبادا کسی چیز کے ساتھ اُلجھ کر کھٹکا پیدا نہ کر دے۔ وہ باہر آگئی، چاند کی روشنی زمین پہ چھٹکی ہوئی تھی پھر بھی ہُو کا عالم تھا۔ کوچہ و بازار بالکل سنسان تھا، فضائے بسیط بالکل ساکت و خاموش، کائنات کا ہر ذرہ محوِ خواب تھا۔ یا رب بچے کا عمل، وہ تن تنہا، ڈری ہوئی، سہمی ہوئی، مندر کی جانب چل پڑی۔ اُس نے خیال کیا کہ اگر اس سنسان میں کوئی بدمعاش، خبیث انسان اس کو سرِ بازار دیکھ لے، بالکل بے باکانہ طور پر آدھی رات کے وقت جاتا ہوا، اور دست درازی کر بیٹھے تو عزت بچانی مشکل ہو جائیگی۔ نیند کے ماتے اس کی چیخ پکار کو نہ سن سکیں گے۔ اُس کے تمام جسم میں تھرتھری پیدا ہو گئی، شرم و حیا سے پسینہ آگیا، رُک گئی، کچھ سوچا، پھر چل پڑی، اُس نے تہیہ کر لیا کہ اگر آج کی رات اپنے ہاتھ کے توڑے ہوئے پھول بلکہ وہی پھول جو مندر کی چاردیواری میں دیوی کے گلے میں ڈال دئے ہیں منوہر کی پُر شباب خلوت میں نہ پہنچا سکی تو ہمیشہ کیلئے گُل چینی ترک کر دونگی۔

اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ قرب و جوار کی کسی چیز پہ نظر ڈالنی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے

اپنے جسم کی تمام قوت ٹانگوں میں مجتمع کردی اور ایسے تیز قدموں کے ساتھ جسکو دوڑنے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے وہ گرتی پڑتی مندر کے دروازے تک پہنچ ہی گئی۔

:(۵):

کواڑ بند تھے لیکن اچھی طرح نہیں، کیونکہ اندر جلنے والے چراغ کی مدھم روشنی جھری میں سے ہوکر باہر آرہی تھی۔ اور یہ ثبوت تھا اس امر کا کہ کنڈی کھلی ہوئی ہے اور کنڈی لگانے سے فائدہ بھی کیا تھا۔ وہ سومناتھ کا مندر تو تھا ہی نہیں، جس میں جواہرات کے بت تھے، وہاں کی کل کائنات کی قیمتِ اصلی اُن کو چُرا کر لے جانے والے کی مزدوری سے بھی زیادہ نہ ہوتی۔ ایسی صورت میں کس سُلطانِ غزنی کا ڈر تھا کہ اس مذہبی متاعِ خاص کی رکھوالی کیجاتی، دروازے کے قریب نگہبان پجاری کی چارپائی تھی، مگر وہ بے خبر محوِ خواب تھا۔

سُربالا کا دل دھڑکنے لگا۔ اُس نے سوچا اگر یہ مذہبی پیشوا بیدار ہوگیا تو اپنی برءیت میں کس حیلے سے کام لوں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ پوجا کا بہانہ نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ آدھی رات آچکی تھی اور اس وقت دیوتا اور دیویاں بھی سو جاتی ہیں۔ نذر کون قبول کرے۔ وہ سچ بات بھی بیان نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ بوڑھا جسکے جذبات فنا ہو چکے تھے۔ یہ تسلیم کرنیسے معذور تھا کہ جب محبت دل میں گھر کر لیتی ہے تو آنکھوں پر بھی پردہ پڑ جاتا ہے اور ایسی صورت میں سوائے مسلکِ عشق کے مذہب و ملت کا کوئی آئین نظر میں نہیں جچتا، ہزاروں دلیلیں اور سینکڑوں نظریے سُن لینے کے بعد بھی وہ یہ نہ مانتا کہ محبت کی خاطر مقدس معبد میں کسی قسم کی چوری جائز ہو سکتی ہے۔ تاہم سُربالا نے پس وپیش میں زیادہ وقت نہیں گذارا اور دوراندیشی کی تمام احتیاطوں کو بالائے طاق رکھکر دروازے

کو کھولنے کی غرض سے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ کواڑ پر رکھدیا۔

اُسکی آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا، سر چکرا رہا تھا اور دماغ اُسی کیفیت میں مُبتلا تھا، جو تیز جھُولے میں گر جانیکے بعد طاری ہو جاتی ہے۔ اُس نے لبوں پر زبان پھیر کر سانس کو سنبھالا اور دو چار بار پلکوں کو جلدی جلدی جھپکا کر قوتِ بینائی میں وہ لوچ پیدا کر لیا جس سے انسان معمول سے زیادہ دیکھنے لگتا ہے۔ اُس نے ہاتھ کے دباؤ میں اضافہ کیا، اور اسکے ساتھ ہی جھری میں بتدریج فصل پیدا ہونے لگا، اس کا دل چور تھا، وہ محسوس کر رہی تھی کہ میں ایک جُرم کا ارتکاب کر رہی ہوں، جو دُنیا والوں کی نگاہ میں ناقابل معافی ہے لیکن محبت کی خاطر جس کی دُنیا میں ہر مجلس قانون ساز کے آئین بدل جاتے ہیں سب کچھ روا ہے۔

دروازہ کھل گیا، لیکن اس قدر آہستہ گویا وہ کھلا ہی نہیں۔ وہ اندر داخل ہو گئی، ایک غیر مرئی سایہ کیطرح۔ مدہم روشنی تھی، چاروں طرف اُداسی چھائی ہوئی۔ کڑوے تیل کا دیا جل رہا تھا، اور اُسکی لَو کے ارتعاش پیہم کے باعث پتھر کی مورت سے لیکر چھت میں آویزاں گجر تک ہر چیز کا سایہ سامنے کی دیواروں پر رقص کر رہا تھا۔ اُس نے اُن میں سے کسی چیز پر نگاہ نہیں ڈالی۔ اسوقت افسانوی رنگ سے زیادہ اس پر ذاتی جذبات کا بھوت سوار تھا۔

اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھی اور مُورت کے بالکل قریب جا کر اُس نے پر سکوت لہجہ میں کہا۔

"دیوی! میں قربان، تو اپنے گلے کا ہار مجھے دیدے، میں یہ اپنے محبوب کو پیش کرونگی۔ اور ہاں اے پتھر کی بے جان مورت!" اُس نے مستفسرانہ لہجہ میں کہا "کیا کبھی تجھکو بھی کسی سے محبت ہوئی ہے؟"

لیکن نہیں ہیں بھولی تیرے پاس تو وہ دل و دماغ ہی نہیں ہیں جن پر محبت کے نقوش ثبت ہو سکتے ہیں۔ تیرا جسم تو پتھر کا ہی، سخت پتھر کا" گویا اُس نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیدیا۔

:۶:

وہ سیڑھی پر چڑھ گئی اور اپنا دایاں ہاتھ مورت کی طرف بڑھا دیا، اُسکی انگلیاں جو باوجود موسم گرما کے سخت سرد ہو رہی تھیں، ہار کے پھولوں سے مس ہوئیں، فوراً قوت برق کی سی ایک تیز لہر سر کی چوٹی سے پاؤں کی ایڑی تک تمام جسم میں جسم کے ہر رونگٹے میں ایک ارتعاش پیدا کر گئی اور جس طرح ساحل دریا پر کھڑے ہو کر پانی کی روانی کو دیر تک دیکھتے رہنے سے چکر آنے لگتے ہیں وہی کیفیت اس پر بھی طاری ہوگئی۔ اگر اس وقت وہ ہوشیاری سے کام لے کر مورت کے آگے بڑھا ہوا ہاتھ نہ پکڑ لیتی تو یقیناً توازن کے بگڑ جانیکے باعث نیچے گر پڑتی اس وقت خدا جانے کیا حشر ہوتا، کیونکہ لازمی امر تھا کہ اس دھماکے سے نگہبان پجاری کی آنکھ کھل جاتی اور پھر سارا حال بھی منکشف ہو جاتا۔

اُس نے سوچا کہ یہ ارادہ ترک کر کے واپس چلا جانا چاہیئے لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ تمام محنت اکارت جاتی ہے اور صرف یہی نہیں، بلکہ ہمیشہ کے لئے وہی بے چینی، وہی جان لیوا اضطراب۔ بھلا وہ کب ساتھ چھوڑیگا، زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ لہذا اُس نے اپنی ہمّت بلند کی، استقلال سے کام لیا۔ اور اس طرح جیسے بلی چوہے پر جھپٹا مارتی ہے۔ اُس نے دیوی کے گلے میں سے اپنا پیش کیا ہوا ہار اُتار لیا۔

اب دوسری مہم مندر سے باہر جانے کی تھی اُس نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ آنکھوں کی

آخری سوئیاں نکالنے میں غفلت ہو جائے اور حصولِ مقاصد سے محروم رہ جاؤں لیکن خود ہی عقائد کی غیر مدلل قوت کو بروئے کار لا کر اُس نے خیال کیا کہ جس پرمیشور نے یہاں تک پہنچنے میں کامیابی دی ہے وہی میری دلی آرزو کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیگا عقائد خواہ کتنے ہی ناقص اور غیر بنیادی کیوں نہ ہوں وقت پر عزم کو راسخ کرنے کیلئے کام آہی جاتے ہیں۔ بھلا سوچنے کی بات ہو اگر کوئی شخص سربالا سے سوال کرتا کہ کیا پرمیشور ہی چوریاں کراتا ہے تو اسکے پاس اپنی ناقص منطق کا کیا جواب ہوتا۔

چنانچہ اندر داخل ہوتے وقت اس نے جس احتیاط سے کام لیا تھا، اسی طرح آہستہ آہستہ دروازہ کھول کر دبے پاؤں باہر نکل گئی۔ اور صبح ہونے کے بعد بھی پجاری کے فرشتوں کو علم نہ ہوا، کہ رات کے وقت مندر میں چوری ہو گئی ہے کیونکہ پھولوں کا معمولی ہار کچھ ایسی زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ اسکی غیر موجودگی کسی کی نظر میں کھٹکے۔

(۷)

وہ ایکبار پھر ڈرتی ہوئی اُسی راستہ سے واپس پلٹی جس پر سے خوف وہراس کے عالم میں گذری تھی، اس کا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ بدن کے ایک ایک عضو میں کپکپی تھی۔ وہ اپنے جھونپڑے کے سامنے سے ہو کر منوہر کے مکان پر پہنچی کیونکہ وہ زیادہ دور نہیں تھا، ہر قدم پر ہیجان جذبات میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہانتک کہ جب اُس نے دروازے کی جھری کے قریب آنکھ کی اور جھانک کر صحن میں دیکھا تو اُسکے جوش میں کبھی نہ ساکن ہونے والے سیماب کی طرح ایک جانسوز تڑپ پیدا ہو گئی، شاید وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ اب میں بھی جوان ہو گئی ہوں۔

اُس نے دیکھا کہ منوہر اپنی شریک حیات کے گلے میں باہیں ڈالے محوِ خواب ہے، اُس نے ایک لمحہ کیلئے سوچا کہ اب کیا تدبیر کرنی چاہیئے، دستک دیکر اُنہیں بیدار کر دینا نہ صرف زبردست حماقت بلکہ ایک حد تک غیر موزوں امر بھی ہے۔ اور بغیر تکمیل مقصد کے واپس چلے جانا گویا ہلاکت آرزو اور پامالی تمنا کے مترادف تھا جس میں شکستگی جذبات کی تھوڑی سی تلخی بھی شامل ہو اور یہ کوئی شخص کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ لہذا اسکے سوا کوئی تدبیر نہیں تھی۔ کہ باہر سے کھڑے ہو کر ہار کو صحن میں اس طرح پھینکے کہ وہ منوہر کے اوپر جا پڑے لیکن اندیشہ تھا کہ اندازہ ٹھیک نہ ہو اور وہ کسی دوسری طرف جا گرے۔ یا ممکن ہے بالاخانہ کی چھت پر جا پڑے۔ وہ سوچتی رہی سوچتی رہی یہانتک کہ مرغانِ سحر کے چہچہے اُسے سنائی دینے لگے، صبح کی سفیدی نمودار ہونے والی تھی، وہ گھبرا گئی، پریشان ہوئی، اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگی کہ تمام وقت سوچنے ہی میں گذار دیا۔ اب کیا کرنا چاہیئے۔ تھوڑی دیر میں لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو جائے گی۔

اُس نے ادہر اُدہر نظر ڈالی اور ہاتھ بڑھا کر دیوار کے اوپر سے ہار صحن میں پھینک دیا۔ اُسکے گرنے کی آواز سنائی دی لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں، وہ اب بالکل ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی، سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔ اس کو اس بات کی بھی فکر تھی کہ کہیں پتا جی بیدار نہ ہو جائیں۔ اگر اُنہوں نے دیکھ لیا کہ سربالا کی چارپائی خالی ہے تو صدہا قسم کے شکوک اُن کے دلمیں پیدا ہو جائیں گے کبھی خیال کریں گے کہ لڑکی آوارہ ہو گئی ہے کسی کیساتھ بھاگ گئی ہے کبھی سوچیں گے کہ شاید پریشانیوں سے تنگ آکر خودکشی کر لی، قریب کی ندی میں جا کر ڈوب مری۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئے گی کہ وہ محبت بھرے دل کیساتھ بارگاہِ عشق میں اپنا پہلا خراج پیش کرنے گئی ہے،

کیونکہ انسان جوں جوں بوڑھا ہوتا جاتا ہے۔ اُسکے حافظہ کی کمزوری رفتہ رفتہ سابقہ زندگیوں کے نقوش کو لوح قلب سے مٹاتی جاتی ہے۔

وہ ہانپتی کانپتی اپنے جھونپڑے میں پہنچی اور اطمینان کا سانس لیا یہ دیکھکر کہ ابھی بوڑھا باپ بیدار نہیں ہوا ہے۔ اُس نے جلدی سے منہ دُھویا، آنکھیں صاف کیں تاکہ بے خوابی کے باعث ان کے اندر نمودار ہو جانے والے سُرخ ڈورے غمازی نہ کرنے لگیں۔

اس کام سے فارغ ہو کر اُس نے اپنی ٹوکری اُٹھائی اور سیدھی چمن میں چلی گئی۔ نہیں معلوم فریب نظر تھا یا کیا، آج کائنات کا ایک ایک ذرہ اُسے درخشاں نظر آ رہا تھا، اُسے ایسا محسوس ہوا گویا گذشتہ رات ہی سے موسم بہار شروع ہوا ہے اور اس سے قبل خزاں تھی۔ اس نے دیکھا کہ غنچے غیر معمولی طور پر زیادہ متبسم ہیں۔ شاید اسکی کامرانی پر ہنس ہنس کے مبارکباد دے رہے تھے، چھوٹی چھوٹی چڑیوں کے پروں میں قوس قزح کا رنگ بھر گیا تھا، اور ان کی نغموں میں بجلی کی سی قوت پیدا ہو گئی تھی۔ اُس نے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی، بادلوں سے ترکیب پانے والے پہاڑوں کی وادیوں میں فرشتے رقص کرتے اور گاتے دکھائی دئے۔ وہ کبھی کبھی کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اسوقت میرا ہی وجود اس آسمانی مخلوق کیلئے موضوع رقص و موسیقی بنا ہوا ہے، لیکن آخر یہ تمام تغیر نظامِ قدرت میں کیوں واقع ہے، اور کائنات کے ذرے کس کے دل کی دھڑکن اور کسکی ضرباتِ نبض کے ساتھ ہم آہنگ ہو جانے کیلئے بیتاب ہیں؟

قبل اسکے کہ اُس کا ذہن ان سوالات کے جواب کی تحقیق کرے، شرم کا پسینہ اسکے چہرے پر نمودار ہو گیا۔ لجاتے ہوئے اُس نے اپنا دامن سنبھالا، اور گلاب کی پتیوں کو چنگی میں مسلتی رہ گئی افسوس

ہے کہ اس فضائے نکہت وصباحت میں اس رنگِ رُخ کے اتار چڑھاؤ کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا وہاں کوئی اتنا بھی نہیں تھا کہ اگر کسی انگلی میں کانٹا چبھ جائے تو اس تکلیف کو اپنی تکلیف محسوس کر کے اظہار ہمدردی کرنے لگے۔

(۸)

شام کے وقت حسب معمول وہ گجرے وغیرہ لے کر چوک گئی۔ لیکن آج شاید سُرمہ در گلو تھی، اُسکی آواز ہی نہ نکلتی تھی۔ اور اگر نکلتی بھی تو اس پرندہ کیطرح جو کہ ایک اسیر دام ہو جانیکے باعث چہچہانا بھول گیا ہو، اُس نے گاہکوں کے ساتھ بے التفاتی برتی۔ وہ معمولی ہار کی قیمت اس قدر زیادہ بتاتی کہ لوگ بگڑ کر چلے جاتے۔ دو ایک منچلے نوجوانوں نے تو یہاں تک کہدیا کہ پھولوں کا مول کر رہی ہو یا خود اپنے حسن کا، اور اگر سُر بالا اپنے خیالات میں محو نہ ہوتی تو یقیناً یہ ناشائستہ الفاظ اُسے برہم کر دیتے۔

وقت گذرتا گیا اور ایک پیسے کی بھی بِکری نہ ہوئی لیکن اُس نے واپس جانیکا نام نہ لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کی منتظر ہے۔ اور یہ تھی بھی حقیقت کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد منوہر آن پہونچا اُسے دیکھ کر سُر بالا نے زمین پر ٹوکری رکھدی۔ اور خود اس طرح علیحدہ کھڑی ہو گئی گویا نظر بچا کر بھاگ جانا چاہتی تھی۔ منوہر نے ایک گجرا اُٹھاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں اس طرح آنکھیں ڈال کر گھورا کہ سُر بالا کی نوکِ مژگاں پر جمے ہوئے آنسو جو نہیں معلوم کب تڑپ کر باہر نکل آئے تھے۔ ضبط کی تاب نہ لاسکے اُس نے یہ سب کچھ دیکھا مگر ظاہر کیا گویا کچھ نہیں دیکھا، اور بیشک مصلحت اسی میں تھی۔ کیونکہ اگر وہ معمولی طور پر اتنا ہی پوچھ لیتا کہ "سُر بالا تم کیوں رونے لگیں؟" تو نہیں کہا جا سکتا کہ خود اُسکے جذبات کی برانگیختگی اس کے نظام ہستی میں کس قسم کی تبدیلی پیدا کر دیتی۔

منوہر نے گجرا ٹوکری میں رکھ دیا اور کسی قدر طنز کیساتھ کہا:۔

"اُونھ! یہ تو کچھ بھی اچھا نہیں ہے۔ رات ہم سو رہے تھے تو کسی آسمانی دیوی نے ہمارے اُوپر ہار ڈال دیا وہ اتنا عمدہ اور اتنا اچھا تھا کہ تعریف نہیں کیجا سکتی۔ سمجھیں سُر بالا؟ مجھے یقین ہے کہ آج بھی کوئی دیوی ہار پھینک جائیگی۔ لہذا میں تم سے کیوں خریدوں۔ ٹھیک ہے نہ؟"

سُر بالا کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ سوائے اسکے کہ اپنے آنسو دُکھی گھڑی میں ایک مصنوعی تبسّم کی جھلک پیدا کر دے۔

منوہر چلا گیا اور وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی، کر بھی کیا سکتی تھی۔ نسائیت مانع تھی۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ بھاگ کر اس سے کہتی کہ رات کو ہار پھینکنے والی دیوی میں ہی ہوں۔"

چند منٹ تک وہ گُم سُم ہی کھڑی رہی اور اسکے بعد واپس لوٹ گئی حسب معمول باپ نے پوچھا کہ پھول کتنے بیچے ہیں۔ اُس نے دروغگوئی سے کام لیتے ہوئے فوراً کہہ دیا کہ سب بک گئے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کو پہلے ہی سے باغیچہ میں ایک محفوظ جگہ چھپا آئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ باپ تو روپے پیسے سے کوئی سروکار نہیں رکھتا، وہ خود ہی ہر قسم کے آمد و خرچ کی مختار تھی۔ اگر وہ یہ کہہ دیتی کہ آج چوک پر پھول کی ایک پتی بھی فروخت نہیں ہوئی تو بہت ممکن تھا کہ دوسرے دن وہ اُسے نہ جانے دیتا، اس خیال سے کہ اب پھولوں کی مانگ کم ہو گئی ہے۔

(۹)

رات کے خاموش لمحے گذرتے چلے جا رہے تھے، مگر سُر بالا کو کسی عنوان نیند نہ آتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود اُس ہی کی مرضی نہیں ہے کہ آنکھ لگے۔ وہ بیدار رہنا چاہتی تھی۔ وہ ایک مخصوص

وقت کی منتظر تھی۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ منوہر کے قول کے مطابق وہ آج پھر ایک دیوی بنکر چمن سے سونے والوں پر پھولوں کی بارش کر دیگی۔ چنانچہ جب بارہ بجے کے گھنٹے کی بھیانک آواز نے رات کے طلسم سکوت کو توڑا تو وہ فوراً اپنی چارپائی سے کھڑی ہو گئی۔ باپ کے خراٹوں کی تیز آواز آسودگیٔ خواب کا تسلی بخش ثبوت تھی۔ اور ظاہر تھا کہ بازاروں میں آمدورفت کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا ہو گا۔

وہ سب سے پہلے باغیچہ میں گئی۔ اور وہاں پوشیدہ ٹوکری میں سے چند گجرے نکال کر دامن میں چھپا لئے، وہ کچھ دیر ٹھٹکی، ٹھہری، اور گہرا سانس لے کر ہر چیز پر مسرت کی نظر ڈالی، پھر چل پڑی۔ کچھ لیسے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کے ساتھ گویا ایک مخصوص منزل مقصود اسکی نظر کے سامنے نہیں ہے۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا، اسکی نبض تیز تر تھی،

وہ چوروں کی طرح چھپتی چھپاتی اور گلیوں میں دوکانوں کے ساتھ لگے ہوئے تختوں کے نیچے سونے والے کتوں سے کتراتی منوہر کے مکان کے قریب پہنچ گئی۔ پہلے سوچا کہ ہاتھ بڑھا کر گجرے پھینک دوں، مگر فوراً خیال آیا کہ جھانک کر دیکھنا چاہیئے کہ منوہر کس شان سے سو رہا ہے۔ چنانچہ اس ارادے کیساتھ وہ دو قدم اور آگے بڑھی، چاہتی تھی کہ چھری میں سے جھانکے کہ اچانک کواڑ کھل گئے۔ منوہر اُسکے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

وہ سر سے پاؤں تک کپکپا اُٹھی۔ روئیں روئیں میں تھرتھری تھی۔ دل کی دھڑکن میں اختلاج کی حد تک اضافہ ہو گیا، ہر شے اسکی نگاہ میں رقص کرتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ پاؤں شل ہو گئے، بھاگ بھی نہیں سکتی تھی، کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ نظریں زمین پر گڑی ہوئی تھیں اور ہاتھ آنچل سنبھالنے

میں مصروف تھے۔ چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا،

آخر منوہر نے طلسم سکوت کو توڑا:۔

"سربالا، کیا تم میرے پاس آئی ہو؟ مجھ سے کوئی ضروری کام ہے؟ ..... اور یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

یہ کہکر اُس نے ساری کے نیچے سے سربالا کا وہ ہاتھ پکڑ لیا جس میں گجرے تھے اور اُنہیں دیکھکر اظہار تنفر کے ساتھ کہا:۔

"میں تو آج ایک بھی پھول نہیں خریدونگا، اگر خریدنے ہوتے تو چوک پر ہی سے لیتا۔ ہاں اگر تم بطور تحفہ پیش کرو تو میں قبول کر سکتا ہوں"

"سربالا کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑگئی اور اگر منوہر نہ سنبھالتا تو یقیناً سب پھول زمین پر گرجاتے۔ لیکن وہ منہ سے نہ بولی، اسکی زبان بند ہوگئی تھی اُسے سانپ سونگھ گیا تھا پھر منوہر بولا، "سربالا اندر آجاؤ۔ دہلیز پر کھڑے رہنا مناسب نہیں ہے۔ میری بیوی میکے چلی گئی ہے۔ آج گھر میں کوئی نہیں ہے"

پہلے تو وہ اندر جانیکے لئے تیار ہوگئی، مگر یہ سنکر کہ گھر میں کوئی نہیں ہے پھر ٹھٹک کر رہ گئی "گھر میں کوئی نہیں ہے" ایک تیز اُکھڑے ہوئے سانس کے ساتھ یہ جملہ اُسکی زبان سے صدائے بازگشت کیطرح نکل گیا۔

"آبھی جاؤ، کیا حرج ہے، تمہاری موجودگی اس تنہائی کو دور کردے گی" یہ کہکر اُس نے سربالا کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے گیا۔ وہ اس طرح چل رہی تھی گویا اُس میں جان ہی نہیں ہے، بلکہ بجلی کی قوت لوہے کی مشین کو چلا رہی ہے۔ صحن میں پلنگ بچھا ہوا تھا لیکن چادر پر ایک بھی شکن نہیں تھی جس سے

ظاہر تھا کہ اس وقت تک کوئی اس پر نہیں لیٹا۔ وہ چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ مگر منوہر نے گھسیٹ کر اپنے قریب بٹھالیا۔

"مجھے معاف کردو، سُربالا! میری غلطی تھی کہ میں نے تمہاری محبت کو ٹھکرا دیا۔ لیکن کل سے محسوس کر رہا ہوں کہ تمناؤں میں تجدید ہو رہی ہے۔ اب تم میری ہو اور میں تمہارا۔ لو میرے ہاتھ سے یہ کنٹھا پہن لو۔"

"نہیں، نہیں، میں ہرگز نہیں پہنونگی۔ یہ خلافِ دستور ہے۔ پھول صرف سہاگنوں کے لئے ہوتے ہیں اور میری ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔ میں کس طرح پہن لوں۔ کیا تم نہیں جانتے؟"

"میں جانتا ہوں، اور اچھی طرح جانتا ہوں لیکن غالباً تم یہ نہیں جانتیں کہ آج کی رات تمہارے لئے سہاگ ہی کی رات ہے اسلئے اپنی پریمی کے ہاتھ سے پھول پہننے میں تامل نہ کرو۔"

(۱۰)

منوہر نے پھونک مار کر چراغ گل کر دیا، اسکی رہی سہی مدہم روشنی بھی غائب ہو گئی، سُربالا کو پہلے تو یقین نہ آتا تھا لیکن منوہر کے سحر سے نہیں اُسے بھی تسلیم کر لینا پڑا کہ بے شک وہ رات اُسکے لئے سہاگ کی پہلی رات تھی۔

خوابِ رنگین

(مکتوب جو ایک خودکشی کرنے والے کی نعش کے ساتھ ملا)

محترمہ!

آپ کا خیال ہے کہ میں اس موضوع پر اپنی رائے کا اظہار کرنے میں چرب زبانی سے کام لے رہا ہوں یا بالکل جھوٹ بول رہا ہوں۔ آپ یقین نہیں کر سکتیں کہ دُنیا میں ایک ایسا شخص بھی ہے جو تمام عرصۂ حیات میں کبھی مبتلائے محبت نہیں ہوا۔ تاہم میں ایک انسان ہونے کی حیثیت سے آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے کبھی محبت نہیں کی۔

اس کی وجہ؟ ——— درحقیقت میں خود بھی نہیں جانتا۔ میں نے کبھی اپنے دل کو اپنی عقل و دانش کے مقابلے میں تیز رفتاری کا موقع نہیں دیا اور نہ کبھی ایک عورت کی محبت میں اس جنون کی حد تک گرویدہ ہوا کہ اپنی خودی کو اسکے حلقۂ دام میں محصور کر لوں۔ آپ کی صنف کے کسی فرد کو اتنی قدرت حاصل نہیں ہوئی کہ اس نے مجھکو رُلایا ہو یا مبتلائے رنج و آلام کیا ہو۔ میں نہ ان راتوں سے آشنا رہا جن کی بیداریوں میں اختر شماری کیجاتی ہے اور نہ اس نمودِ سحر سے واقف ہوں، جسکی خوشگوار فضا

میں محرومِ لذت کام و دہن رہنا پڑتا ہے۔ اُمید و بیم میرے لئے الفاظ بے معنی ہیں۔ کیونکہ میں نے کبھی محبت نہیں کی۔

اکثر میں خود متعجب ہوتا ہوں کہ آخر میرے ساتھ ایسا اتفاق کیوں نہیں ہوا۔ اس کا تسلی بخش جواب صرف ایک ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ میں عورت کی ذہنیت سمجھنے میں اتنا اچھا نقاد ہو گیا ہوں کہ کسی شخصیت سے اثر پذیر ہو کر مرعوب نہیں ہو سکتا۔ محترمہ! میری اس صاف گوئی پر اظہارِ برہمی نہ کریں۔ .... آپ جانتی ہیں کہ ہر متنفس کی ایک مادی شخصیت ہوتی ہے اور دوسری روحانی ...... اور لازمی طور پر آپ کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ کسی سے صادق اور پُر خلوص محبت کرنے کے لئے محبوب کی ذات میں ان دونوں شخصیتوں کا باہمی اجتماع اور ہم آہنگ ہونا اشد ضروری ہے لیکن فی زمانہ یہ حسن امتزاج شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوتا ہے۔ کیونکہ بسا اوقات آپ دیکھیں گی کہ ایک عورت ظاہری اعتبار سے پیکرِ حسن و جمال اور مجسمۂ شباب و رعنائی ہے لیکن بلحاظ فطرت و ذہنیت ایک قابلِ نفریں دخترِ اہرمن۔ اور کبھی یہ بھی مشاہدہ میں آئیگا کہ ایک عورت اخلاق برگزیدہ و اوصاف حمیدہ کی بنا پر تقدس مآب دیوی کہلائے جانے کے لائق ہے لیکن جسمانی موزونیت کے لحاظ سے اُسکی کوئی خوبی کسی کو اپنی طرف مائل کر لینے کے لئے مقناطیسی کشش نہیں رکھتی۔

محبت کرنے کے لئے مرد کو اندھا ہو جانا ضروری ہے اسے چاہیئے کہ صرف جذبۂ الوہیت کی ساتھ اندھا دھند محبت کے جال میں جا گرے اور محبوبہ کے نقائص و عیوب کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لے۔ وہ اسکے ساتھ دورانِ گفتگو میں سنجیدہ موضوع کو زیرِ بحث نہ لائے۔ وہ اس کے نازک لبوں پر صرف مُہرِ الفت ثبت کرے۔ اور اسے اپنا بنا لے۔ محبوبہ کی ہرزہ کاریاں اور خیالاتِ باطلہ اس کی

نظر میں ایسے معلوم ہوں گویا یہی شانِ حسن اور اقتضائے جمال ہے۔ خیر! میں اس کورچشمی کا طالب نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ انسان سے لیکر کائنات کے ذروں تک ہر شے کو حقائق کی روشنی میں دیکھوں نہ کہ اپنی آرزوں اور تمناؤں کے مطابق۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ حسین و جمیل لڑکیاں ہی خلاف توقع بے مہر و فا ثابت ہوتی ہیں۔ برخلاف اسکے سادہ لوح ہستیاں کبھی مایوس نہیں کرتیں کیونکہ ان سے کسی چیز کی توقع ہی نہیں کیجاتی۔

تاہم عرصہ دراز ہوا۔ مجھے یقین واثق ہو گیا تھا کہ میں گرفتار محبت ہوں۔ صرف ایک ساعت کیلئے محض ایک خوشگوار رات میں لیکن سب سے زیادہ فضا اور ماحول میری گرفتاری میں ممد و معاون تھے۔ مجھے یقین ہے کہ واقعات کی تفصیل سن کر آپ بھی اس ضمن میں میری ہی ہم خیال ہو جائیں گی۔ اچھا سنئے۔

ایکروز شام کے وقت ایک حسین دوشیزہ سے میری ملاقات ہوئی۔ عالی حوصلگی اور جدت طرازی اسکی فطرت میں داخل تھی۔ لہذا اس نے تجویز پیش کی کہ ہم دونوں تمام شب دریا کی پرسکون سطح پر ایک سفینہ کے آغوش میں بسر کریں۔ اگر مجھ سے پوچھا جاتا تو میں گھر کی چار دیواری میں شب بیداری کو ترجیح دیتا۔ مجھے یہ زیادہ مرغوب ہے۔ تاہم محض دلبستگی کے طور پر میں نے سفینہ میں بیٹھنے کی دعوت قبول کر لی۔

جون کا مہینہ تقوی شکن سہانی رات۔ خوشگوار چھٹکی ہوئی چاندنی، باد صرصر کے لطیف جھونکے، ہم تقریباً دس بجے روانہ ہوئے۔ میں کسی قدر کبیدہ خاطر تھا لیکن میری شریک سفر جوش مسرت میں جھوم رہی تھی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ چپو اٹھائے۔ اور روانگی عمل میں آگئی۔

دل فریب نظارہ تھا، دریا میں کہیں کہیں خشکی کے ٹیلے اُبھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ان پر درختوں کی ہریاول اور ان میں قمری و عنادل کے روح پرور چہچہے، پانی کی روانی آہستہ آہستہ ہمکو بہاتی رہی، ساحل کے قریب دلدل میں مینڈک ٹرّا رہے تھے۔ جھاڑیوں میں ہوا مدہم سُروں کا راگ گاتی معلوم ہوتی تھی ہم دونوں پر سہانی رات کی لطیف اور خوشگوار رعنائیوں کا اثر طاری ہوتا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ صرف ایسے وقت میں زندہ رہنا حقیقی زندگی کے مترادف ہے۔ اور وہ بھی ایک نوخیز پُرشباب، حسین و جمیل دوشیزہ کے پہلو میں۔

نقرئی چاندنی کی مستی و سرشاری اور اپنی ہم جلیس کے انتہائی قرب کے احساس سے میری رگوں میں تلاطم جذبات اور جوشش ترنگ کی سیمابی کیفیت پیدا ہوگئی،

"ہم کو اسی طرح بہتے رہنا چاہیئے" اُس نے کہا "آؤ۔ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ اور چپّو ہاتھ سے رکھدو"

میں نے ارشاد کی تعمیل کی۔ اُس وقت میں اسکے ہر حکم کو دائرہ عمل میں لانیکے لئے تیار تھا۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے کچھ اشعار سُناؤ"

میں نے حیل و حجت کرنی چاہی لیکن اس کے اصرار نے مجبور کردیا۔ ظاہر ہے کہ وہ ہر اُس شئے کو حاصل کرنے پر تُلی ہوئی تھی جس کے ذریعے ہیجانِ جذبات ممکن ہو——— سہانی رات ——— نقرئی چاندنی ——— پرسکون سطح آب۔ فضائے شعر و سخن۔ اور ایک جوان مرد اسکے پہلو میں محض سنانے کی غرض سے میں نے غلط سُروں میں گانا شروع کردیا۔ اور اشعار بھی فارسی کے منتخب کئے

جنکا سمجھنا اسکے لیے کسی قدر دشوار تھا لیکن مجھے سخت تعجب ہوا جب میری بیہودگی پر ملامت کرنے کی بجائے وہ فہیمانہ طور پر اپنے سر کو جنبش دیتی رہی۔ گویا خوب سمجھ کر داد دے رہی ہے۔ اور ساتھ ہی دبی زبان سے کہا۔

"یہ الفاظ صداقت سے کس قدر لبریز ہیں"

میں ورطۂ استعجاب میں غرق تھا حقیقتاً" اتنی سمجھدار عورتیں کہاں ہیں۔ ہمارا چھوٹا سفینہ پانی پر چھائے ہوئے درختوں کے سایہ میں گذر رہا تھا میں نے اپنی ہم جلیس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنے آغوش میں لے لیا اور آہستہ آہستہ اپنے لبوں کو اسکی پیشانی تک پہنچانے کی کوشش کی لیکن فوری غصہ کیساتھ اس نے جواب دیا۔

"بس مجھے تنہا چھوڑ دو، تم ہر ایک چیز میں بے لطفی پیدا کر رہے ہو"

میں نے کوشش کی کہ کسی طرح اس کو منالوں لیکن اس نے علیحدہ ہو جانے کیلئے بہت جد وجہد کی اور پانی پر چھائے ہوئے درخت کی ایک شاخ کو اس قدر گھبراہٹ کے ساتھ پکڑا کہ مجھے گمان ہوا بس اب سفینہ اُلٹ جائیگا اور ہم دونوں پانی میں جا گریں گے۔ اس نے کہا:-

"اگر تم پانی میں گر پڑے تو یہ سزا تمہارے لئے مناسب ہوگی۔ مرد کس قدر اُجڈ ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ چاہتے ہیں کہ شکستِ خواب کر کے دوسری ہستی کو بیدار کر دیا جائے۔ اور ہاں تم تو ابھی ابھی مجھکو کچھ اشعار سُنا رہے تھے"

اُس نے مجھے لاجواب کر دیا میں خاموش تھا۔

پھر اُس نے کہا "ہمیں کچھ اور دور چلنا چاہیئے"

میں نے خیال کرنا شروع کیا کہ واقعات غیر موزوں سے ہوتے جا رہے ہیں اور یہ فکر بھی دامنگیر ہوئی کہ تمام رات اسی طرح ضائع ہوگی۔ میری ہم جلیس نے مجھ سے کہا۔

"میں تم سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں"

"بہتر" میں نے جواب دیا "بشرطیکہ میں اسے پورا کر سکوں"

"اچھا وعدہ کرو کہ تم بالکل خاموش اور نیک بنے رہو گے۔ اگر میں تم کو اجازت دوں۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔"

"کیا؟"

"اگر میں تمکو اجازت دوں میرے قریب پہلو میں لیٹ جاؤ۔ سفینہ کے زیرین حصہ میں۔ اور میری طرح آسمان پر چمکنے والے ستاروں کا مشاہدہ کرتے رہو"

میں نے محسوس کیا کہ صورتِ حال مضحکہ خیز ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن پھر بھی جواب دیا۔

"بہت بہتر جو آپ کی مرضی ہو"

"تمہیں معلوم ہونا چاہیئے" اس نے وضاحت سے کہا "تمکو ہرگز اجازت نہیں ہوگی ـــ مجھے چھونے کی ـــ مجھے پیار کرنے کی۔۔۔۔۔ یا۔۔۔۔۔ یا۔۔۔۔۔ یا مجھے چھیڑنے کی۔ مجھے ستانے کی"

"میں وعدہ کرتا ہوں"

"اور اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی تو میں سفینہ کو اُلٹ دونگی"

کس قدر واہیات بات تھی۔ ہم قریب لیٹے رہے۔ سفینہ کی خفیف جنبشوں کا ترنم اور وہ نغمۂ حیات

جو ساحل کی طرف سے مدہم سُروں میں سُنائی دے رہا تھا، ہمارے لئے لوری بنکر رہ گیا۔ اور عین اس لمحہ —— اپنی تمام زندگی میں پہلی مرتبہ —— کسی سے محبت کرنے کی آرزو میرے دل میں پیدا ہو گئی۔ میں نے چاہا کہ اپنے وجود مطلق کے اسرار و رموز کو کسی پر منکشف کر دوں۔ اور بطور خراج اُسے پیش کر دوں —— اپنے تخیل کا پرتو —— اپنے جسم کی موزونیت —— اپنے قلب کی پُرخلوص تپش —— اپنی حیات کی سرمستیاں ۔ اور ہر وہ چیز جو مجھ سے متعلق ہو۔

اچانک میری ہمجلیس نے خواب کی سی دُنیا میں ایک ایسی آواز میں جو بہت دور سے آ رہی ہو —— مدہم سُروں میں کہا۔

"ہم کہاں ہیں؟ کدھر جا رہے ہیں؟ ...... معلوم ہوتا ہے ہم کرۂ ارض کی کشش ثقل سے نکل چکے ہیں، سرحد ادراک سے بھی پرے ہیں۔ کتنا پُرلطف سماں ہے، آہ! کاش! تم مجھ سے تھوڑی ہی سی محبت کرتے!!"

میرے دِل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کر دیا۔ اور میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے، میں نے خیال کیا کہ ایسا ہو گیا ہو۔ پھر بھی میرے اندر کوئی رکیک جذبہ بیدار نہیں ہوا۔ میں نے صرف محسوس کیا کہ میں کامل سکون کی دُنیا میں ہوں —— اِسی مقام پر —— اس حسینہ کے پہلو میں —— اور بس یہ احساس ہی میرے لئے کافی تھا۔

اسی طرح ہم بہت دیر تک لیٹے رہے ۔ بہت دیر تک ۔ جنبش کئے بغیر ۔ ہم نے ایکدوسرے کا ہاتھ میں ہاتھ لے لیا —— دلنوازانہ طریقہ پر —— خاموشی کیساتھ —— کوئی نامعلوم قوت ہم پر حاوی تھی —— غیر محسوس طریقہ پہ —— ہمارے درمیان ایک رشتہ قائم ہو گیا۔

پُراسرار ــــ اُلوہیانہ ــــ تعجب انگیز ــــ آخر وہ کیا تھا ــــ شاید اسی کا نام محبت ہو۔

سکوتِ شب کا طلسم صبح کاذب کی نمود سے ٹوٹ گیا۔ تقریباً تین بجے کا عمل ہوگا۔ سفینہ کسی شئے سے ٹکرایا۔ وہ ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ میں بحرِ تحیّر میں غرق ہوگیا۔ آسمان کی تمام سطح سرخ گلابی اور عبیر آلود ہونے لگی، بادل کے شگافوں میں سے نورِ سحر پھوٹنے لگا، دریا کا پانی خونابہ بن گیا اور اسکے دونوں ساحل آتش گرفتہ معلوم ہونے لگے۔

میں اپنی ہم جلیس کی طرف جُھک گیا تاکہ اس دل فریب منظرِ نور و ضیا سے لطف اندوزی حاصل کرنے میں اسے بھی شریک کرلوں لیکن مجھ سے یہ نہ ہوسکا۔ بلکہ میں خود اسکے پرتوِ جمال کی آئینہ سامانی میں محو ہوکر رہ گیا۔ کیونکہ وہ بھی شفق کی طرح گلِ تمتماتی تھی ــــ اس کے رخسار ــــ اسکے لب ــــ اس کا تبسم ــــ اس کا لباس ــــ وہ پھولوں کی شہزادی معلوم ہوتی تھی۔ اور عین اُس وقت میں اسے "صبح کی دیوی" سمجھنے لگا۔

وہ نزاکت کے ساتھ اُٹھی اور اپنے لب مجھے پیش کردیئے میں اس کی طرف بڑھا، پیشقدمی اور انبساط کے کیف ارتعاش میں ڈوبا ہوا۔ گویا میں ایک آستانۂ قدوسی کا بوسہ لینے والا تھا۔ ایک ایسے خواب کا بوسہ لینے والا جو پیکر نسائی میں تبدیل ہوگیا ہو........

اس نے مجھ سے کہا........

"آہ! میرے محبوب! تمہارے ریشمی بالوں میں ایک کیڑا اُلجھ رہا ہے"

شاید اسکے تبسم کی یہی وجہ تھی۔ میں نے اپنے سر پر ایک ضرب سی محسوس کی۔ اور ایسا معلوم ہوا گویا نمودِ سحر سے قبل ہی فضا کی تمام رعنائیاں دور ہوگئی ہیں۔ اور طلسمِ خواب کے ٹوٹتے ہی

میں اس دنیائے آب و گِل میں آگیا ہوں۔ اور بس۔

یہ محض الٰہی اور طفل تسلی ہے۔ جو چاہو سمجھو لیکن یہی وہ معمولی سی بات ہے جو انسان کو دِل برداشتہ کر دیتی ہے۔ اور سب سے زیادہ دلربا ہستی سے متنفر۔

بہر حال اس دن سے آجتک میں نے کسی سے محبت نہیں کی ✣

افسانہائے عشق!

قالبِ انساں ازل میں عشق کی خاطر بنا
اس نشیلی مے کے لائق بس یہی پیمانہ تھا

انسان کی تخلیق میں علاوہ ان عناصر اربعہ کے جنکا تجربہ کیمیاوی طریقہ پہ کیا گیا ہے محبّت کا عنصر بھی شامل ہے، یہ دوسری بات ہے کہ کسی میں یہ جز وکم ہے کسی میں زیادہ بعض میں نشوونما پانے سے قبل فنا ہوجاتا ہے اور بعض میں نشوونما پاکر اس قدر زیادتی حاصل کرتا ہے کہ دوسرے عناصر بھی اس سے مغلوب ہوجاتے ہیں۔ اس وقت انسان کو ایک ایسا درجۂ امتیاز حاصل ہوجاتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اس دنیائے آب و گل کو ٹھکرا کر ایک جدید نظام کائنات قائم کر دے۔

بہت عرصہ ہوا عہد طفلی کا ذکر ہے، ایک رات میں نے دادا جان سے کہا۔

"دادا ابا کوئی کہانی سناؤ"۔

پہلے اُنھوں نے ٹال دینا چاہا مگر میرے اصرار پہ کہنے لگے۔

"اچھا سنو۔ کوہ قاف کی پریوں میں ایک پری تھی جس کا نام نیلم پری تھا۔ ایکدن وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ سیر کو نکلی، دور ہوا میں اُڑتے اُڑتے اپنی پرستان کی حد سے باہر نکل گئی، اچانک اسکی نظر نیچے زمین پر پڑی اور ایک شاہزادہ کو دیکھا، جو جنگل میں شکار کھیل رہا تھا، پری نے پہلی مرتبہ انسان کی شکل دیکھی تھی، وہ اسے دیکھتے ہی عاشق ہوگئی اور اپنی سہیلیوں سے کہا۔

"کسی طرح اس آدم زاد کو بیہوش کر کے میرے محل میں لے چلو"۔ چنانچہ ...."

یہانتک کہ نیند آنے سے قبل کہانی ختم ہوگئی۔

چند سال بعد میں مدرسے کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ ایک ہم جماعت نے کھڑے ہو کر کتاب کھولی اور پڑھنا شروع کیا۔

"حاتم نے منیر شامی کو بہت کچھ دلاسا دیکر کہا، کہ تمہارے جذبات محبت نے میرے دل پر بہت اثر کیا، خدا کرے تمہاری دلی مراد پوری ہو، میں انتہائی کوشش کرونگا کہ حسن بانو کے تمام سوالات کا جواب دیکر تمہارے ساتھ اسکی شادی کرادوں، میری واپسی تک ...."

حتی کہ وقت ختم ہوگیا، مگر قصہ کی تکمیل نہ ہوئی۔ اس لئے باقی حصہ دوسرے دن کے لئے ملتوی کر دیا۔

مدرسہ کی تعلیم کے بعد کالج کا زمانہ آیا۔ اب خیالات میں کسی قدر زیادہ پختگی اور مطالعہ میں وسعت پیدا ہو چلی تھی، بزم ادب کا سالانہ جلسہ ہوا، ناظم مجلس نے زبردستی میرا نام بھی مقررین کی فہرست میں شامل کر دیا "فلسفۂ محبت" پر اظہار خیال کرنے کی فرمائش ہوئی، میں نے شاعرانہ موشگافیوں سے

قطعاً خالی الذہن ہو کر نہایت محققانہ طریقہ پر ایسی موثر تقریر کی کہ سامعین عشعش کرنے لگے، میں نے فلاسفۂ یونان کے خیالات زریں بھی پیش کئے اور حکمائے عرب کے غیر فانی اقوال کا حوالہ بھی دیا، تاکہ بیان میں زیادہ زور پیدا ہو جائے لیکن جب میں اس نقطہ پہ پہنچا کہ "محبت کیوں ہو جاتی ہے"؟ تو میرے حواس گُم ہو گئے اس نتیجے سے جواب کو فلسفہ کی روشنی میں ــــ جس کے محض نظریئے عملی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے ــــ پیش کرنا تضیع اوقات تھا اور اگر میں یہ کہہ دیتا کہ اس کا جواب صرف اس صورت میں ممکن ہے جب کہ قسام ازل کی طرف سے زبان کو بینائی یا آنکھوں کو گویائی ان قوتوں کے علاوہ نصیب ہو جائے جو پہلے سے انکو ودیعت کی جا چکی ہیں تو شاید لوگ اسے کبھی شاعری سمجھتے، حالانکہ یہ حقیقت ہے۔

ایک سہانی رات تھی، تھیٹر ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا، تل دھرنے کی جگہ نہ تھی کہ یکایک موسیقی کی ایک دلنواز لے کے ساتھ پردے اُٹھے اور لیلیٰ مجنوں کا ڈرامہ شروع ہو گیا، ہندوستان کی ایک مایۂ ناز ایکٹرس ہیروئن کا پارٹ کر رہی تھی، زمانۂ مکتب سے آغاز محبت، جذبات صادق کی بتدریج ترقی، اضطراب مسلسل کی دائمی سکون کوشی، والدین کی ضد، عزیز اقارب کے ظلم و ستم، رسم و رواج کی پابندیاں، آرزوؤں کی پامالی، خون کے آنسو، فراق کے صدمے، جنگل کی لامتناہی وسعتوں میں وحشی جانوروں کے ساتھ بود و باش اور آخر کار ناکامیٔ عشق کا المناک انجام ــــ غرض یہ کہ صبح کاذب کے نمودار ہونے سے قبل سب کچھ ہوا اور ہو کر رہ گیا۔

ایک روز بیٹھے بیٹھے جی میں آئی کہ لاؤ ہم بھی کوئی افسانہ لکھیں، سینکڑوں ناولوں کا مطالعہ کیا تھا، انگریزی رسائل میں بے شمار افسانے پڑھے تھے کچھ خیال کہیں سے لیا کچھ کہیں سے، یہاں تک کہ ایک نیا پلاٹ تیار ہو گیا "افسانۂ محبت" اس کا عنوان قائم کیا حسن و جمال کی نیرنگیوں سے قطعی ناواقف عشق و محبت کے سحر حلال سے ناآشنائے محض، لوگوں سے سنا تھا کتابوں میں پڑھا تھا کہ ایک کیفیت کا نام ہے، اور دوسرا حشر جذبات کا، انہی سنی سنائی، پڑھی پڑھائی باتوں کا اعادہ اپنے الفاظ میں کر دیا، افسانہ مکمل ہو چکا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ شاعر تلمیذ الرحمن ہوتا ہے اور شاعری ایک ودیعت خاص ہے جو ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں طبیعت موزوں ہونی چاہیئے، کچھ عرصہ اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کیا اور پھر حسن و عشق، گل و بلبل، آہ و فغاں، شمع و پروانہ، وصل و ہجر، شراب ساقی وغیرہ کو دیگر الفاظ کے امتزاج سے مختلف پیرایہ میں بیان کرنا شروع کر دیا، اب مجھ ہی کو دیکھ لیجئے کہ دل کے معمولی جوش و ولولے کی بنا پر شاعر بن بیٹھے۔ خواہ جذبات کے ماتحت کسی حسینہ کیطرف دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا ہو مگر اس فن لطیف کے طفیل نت نئے معشوق زینت آغوش ہونے لگے۔

مناظر قدرت کی نقاشی میری زندگی کا بہترین مشغلہ بن گئی تھی، ایک روز بارش کے اختتام پر جب کہ باد و باراں کا طوفان مضمحل ہو کر سکون و طمانیت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میں دریا کے کنارے ٹہلنے چل دیا خیال تھا کہ ضرور کوئی دلفریب منظر فردوس نگاہ بن جائیگا اور موئے قلم کے وسیلہ سے

۹۱۳ 1113 ۷۹۷

اس کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرونگا، ابھی چند لمحے بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ فضا میں نغمے منتشر ہو کر ایک تموّج پیدا کرنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ ایک حسینہ ہاتھ میں بربط لئے ساحل کے قریب بیٹھی گا رہی ہے۔ موسیقی کا یہ کمال کہ سننے والوں کی روح بھی ان لطیف ترانوں پر تصدق ہو جانے کیلئے ایکبار تڑپ اُٹھے، وہ سامعہ نواز آواز سن کر اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے محسوس ہوا کہ ساز کے بے جان تاروں کو بھی صنف نازک کے لحن عبودیت سے اکتساب ترنم کا شرف حاصل ہے، وہ چاہتی تھی کہ اپنے راگ کی مقناطیسی قوت سے پانی کی روانی کو مسحور کر کے منجمد کردے، یا پھر یہ ہو کہ دریا کے عمق میں سونے والی جل پریاں خواب غفلت سے بیدار ہو کر بشکل حباب آب رواں کی چادر سیماب پر اُبھر آئیں اور اگر یہ بھی کافی نہ ہو تو کم از کم کشش ثقل زمین کی طبقات سے نکلکر خود اسکے وجود محترم میں جذب ہو جائے تاکہ کائنات کا ہر ذرہ اس کو مرکز تصور کر کے فضا میں رقص کرتا ہوا، اس کے فلک پیما قدموں میں آگرے۔

ابتدائی دور حیات کا بیشتر حصہ چچا زاد بہن حمیلہ کے ساتھ گذرا تھا، مگر اس زمانہ میں نہ اسکے اعضاء کے اندر کچھ کشش و جاذبیت ہی مستور تھی، نہ میرے جسم میں ایک دوسری شئے کی جانب کھنچ جانے کی صلاحیت، ہاں آٹھ سال کی طویل مدت کے بعد چچا پنشن لے کر کلکتہ سے وطن واپس آئے تو اس کا رنگ ہی کچھ اور تھا، حسن کی صحیح کیفیات نہ آجتک شرمندۂ الفاظ ہوئی ہیں، نہ ہو سکتی ہیں، اس لئے میں بھی یہ بیان کرنے سے قاصر ہوں کہ اسکی وہ کونسی ادا تھی جس نے بیک نظر میرے دل کو موہ لیا۔ یہ سچ ہے کہ محبت کا تعلق نفس سے نہیں بلکہ صرف دل سے ہے،

مگر بیداری جذبات کے بغیر اس منزل میں گامزن ہو جانا غیر ممکن ہے۔

اس کی آنکھوں کی وحشت اور انداز جنوں سے ظاہر تھا کہ وہ کسی شے کی تلاش میں خود اپنی ہستی کو گم کر دینا چاہتی ہے، افق رُخ پر پھیل جانے والی شفق غمازی کر رہی تھی کہ اسکی رگوں میں دوڑنے والے خون کے اندر سیمابی کیفیت پیدا ہو چلی ہے۔ ہیجان تنفس سے سینہ کی سطح کا نشیب و فراز صاف بتا رہا تھا کہ اسکے مینائے شباب دوسری صنف کیساتھ تبادلہ صہبا کے لئے بیتاب ہیں۔

پہلی ہی ملاقات میں اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ ایسی بیگانگی سے دیکھا گویا اس سے قبل شناسائی ہی نہیں تھی، مگر بیگانگی کی یہ ادا ہی ایک ایسی ادا ہے جو بسا اوقات ایک شرح بسیط بن جاتی ہے۔ اور تکلم خاموش سے وہ راز سُنا دیا جاتا ہے جس کی سماعت صرف لبوں کے ذریعہ ممکن ہے میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے میرا سب کچھ چھین کر لے گئی۔ مگر ایک ایسی شے دے گئی جو اس سے قبل میرے پاس نہیں تھی۔

غنیمت ہے کہ خود والد صاحب ہی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ میری شادی جمیلہ کے ساتھ ہو جائے تو بہتر ہے، چچا کے سامنے تجویز پیش کی گئی، جو انہوں نے فوراً منظور کر لی، اور ہم دونوں نے عشق کے دیوتا کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ہماری داستان محبت کو ایک المیہ رومان میں تبدیل نہیں کیا۔

بہت زمانہ گذر گیا پرسوں رات کا ذکر ہے کہ اظہر میرا پیارا پوتا میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"دادا! کوئی کہانی سناؤ"

مجھ میں ضعیفی کے باعث زیادہ دیر بولنے کی ہمت نہیں تھی، اس لئے پہلے تو ٹال دینا چاہا، مگر اُسکے اصرار پر میں نے کہا۔

"اچھا سنو! کوہ قاف کی پریوں میں ایک پری تھی جس کا نام نیلم پری تھا، ایک دن وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ سیر کے لئے نکلی، اور ہوا میں اُڑتے اڑتے اپنے پرستان کی حد سے باہر نکل گئی اچانک اسکی نظر نیچے زمین پر پڑی، اور ایک شاہزادہ کو دیکھا جو جنگل میں تنکا کھیل رہا تھا، پری نے پہلی مرتبہ انسان کی شکل دیکھی تھی، وہ اسے دیکھتے ہی عاشق ہو گئی۔ اور اپنی سہیلیوں سے کہا۔

"کسی طرح اِس آدم زاد کو بیہوش کر کے میرے محل میں لے چلو۔ چنانچہ ...."

یہانتک کہ نیند آنے سے قبل کہانی ختم ہو گئی۔

غلط فہمی!

پندرہ سال کا طویل عرصہ ۔قید بامشقت ۔ اور وہ بھی وطن مالوف سے کوسوں دور۔ ایک غیر مہذب جزیرہ میں جہاں غم خواری کے لئے نہ دوست احباب تھے ، نہ ہمدردی کیلئے عزیز واقارب۔ پھر اس تمام دوران میں یہ حقیقت اسکے لئے سوہان روح بنی رہی کہ جس جرم کی پاداش میں اس کو جلاوطن کیا گیا وہ محض الزام ہے ۔ وہ بالکل بے قصور تھا، صرف واقعات نے ایسی صورت اختیار کی کہ عدالت اسکے خلاف فیصلہ کرنے کے لئے مجبور ہوگئی ۔ قید و بند کی طویل مدت میں اس نے بارہا ارادہ کیا کہ خودکشی کرے ۔ کیونکہ ایسی بدرنگ و بے لطف زندگی سے مرجانا بہتر تھا لیکن اُمید کی ایک ہلکی سی جھلک اس کو اپنے ارادوں سے باز رکھتی رہی ۔ اسے یقین تھا کہ معینہ وقت گذر جانیکے بعد وہ اپنے عزیز و اقارب میں جا ملیگا ۔مسلسل غم واندوہ نے اسکے خدوخال کو بالکل مضمحل کردیا تھا ناموافق آب و ہوا سے اسکی صحت بھی خراب ہوچکی تھی ۔ بالوں کا سفید ہوجانا لازمی تھا، آنکھوں کی بصارت بھی کسی قدر کم ہوگئی تھی ۔ دوچار دانت شکستہ ہوچکے تھے کمزوری کا یہ عالم کہ قدم اُٹھاتے ہوئے ٹانگیں لڑکھڑاتی تھیں ۔

قید سے رہائی حاصل کرنے کے بعد وہ سبدھا اپنے وطن گیا۔ اسے گلی کوچے یاد تھے۔ اپنا مکان بھی یاد تھا لیکن تلاش کرنے کی زحمت اُٹھانی پڑی کیونکہ شہر کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھی۔ عمارتیں نئی شان کی تھیں۔ بازاروں کی رونق بڑھ گئی تھی۔ کسی کسی گلی کا نام بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ تاہم وہ دریافت کرتے کرتے منزل مقصود پر پہنچ گیا، سڑک پر کھڑے ہو کر اس نے اپنے مکان پر نگاہ ڈالی۔ دیواروں کی شکستگی اور دروازوں کی بوسیدگی میں اسے سینکڑوں افسانے پنہاں نظر آئے۔ اس نے زینہ کی سیڑھیوں کو دیکھا جس پر اپنے مضبوط قدم رکھکر وہ ہزاروں بار اُترا چڑھا تھا۔ لیکن آج اُوپر جاتے ہوئے اسکی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اب بھی اسکی شریک حیات اِسی چاردیواری میں زندگی کے دن پورے کرتی ہے یا نہیں، وہ جھجک رہا تھا کہ کہیں غیر کا گھر نہ ہو۔

وہ کھڑا سوچتا رہا۔ آواز دے نوکیں کو دے۔ وطن کو خیرباد کہتے وقت اُسنے اپنی آرزوؤں کا ثمرہ صرف ایک شیر خوار لڑکی کی شکل میں چھوڑا تھا۔ چند راہگیروں سے کچھ دریافت بھی کیا۔ مگر مطلب برآری نہ ہو سکی۔ کسی نے ٹال دیا اور کسی نے غیر تسلی بخش جواب دیا۔ مایوس ہو کر اسے کہیں اور چلا جانا چاہیے تھا۔ مگر ایک نامعلوم کشش اسے کھینچ رہی تھی آخر وہ جرأت کر کے زینہ پر چڑھ گیا، اس خیال سے کہ اگر جگہ غلط بھی ہوئی تو زیادہ سے زیادہ معافی مانگ لیگا۔ اسکی حالت قابل رحم تھی کوئی سختی کیسا تھی اس سے باز پرس نہ کرتا۔

اُوپر کا دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ ایک تو مکروہ صورت اور پھر مداخلت بے جا۔ ہر شخص کو تھوڑی دیر کے واسطے خوفزدہ کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اس نے دیکھا

ایک عورت سہم کر ایک مرد سے چمٹ گئی ہے۔ گھر میں تیسرا متنفس کوئی نہیں تھا۔ وہ زیادہ قریب پہنچ گیا اور خوب غور سے دیکھنے کے بعد پہچان لیا کہ عورت سوائے کملا کے کوئی نہیں لیکن وہ حیران تھا۔ کہ اسکے خدوخال میں فرق کیوں نہیں آیا۔ وہ اسی طرح شگفتہ و شاداب اور خرم و شاد تھی۔ عہد شباب کی رنگینیاں ابھی تک اسکے اعضاء سے نمایاں تھیں، برخلاف اسکے وہ خود بوڑھا ہو چکا تھا۔ اپنی بیوی کو ایک غیر شخص کے ساتھ دیکھکر اسکی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ مگر انتقام لینے کی قوت اسکے اعضا سے مفقود ہو چکی تھی۔ وہ خود لڑکھڑا کر گر پڑا۔

اسکی نگاہیں عورت پر جمی ہوئی تھیں، وہ ایک فلسفی کی طرح گذشتہ واقعات زندگی پر غور کرنے لگا۔ وہ کملا کو الفت و محبت کی دیوی سمجھتا تھا لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ تصنع سے کام لیتی تھی۔ عورت بہت زیادہ بے وفا ہوتی ہے اور ہرجائی ہونا اسکی فطرت میں داخل ہے۔ لبا اوقات وہ اپنے جذبات کے سامنے مذہبی عقائد کی بھی قدر نہیں کرتی۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ ہندو دھرم کی پیرو ہوتے ہوئے اس نے کس طرح گوارا کر لیا کہ ایک شخص کی ہو جانے کے بعد پھر کسی دوسرے شخص کی ہو جائے۔

دل ہی دل میں وہ اسکو برا بھلا کہتا رہا۔ اسکا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اٹھکر اسکے بال نوچ لے اور مارتے مارتے اس کا تمام جسم سوجا دے۔ وہ خود بھی پشیمان تھا کہ مسلسل پندرہ برس مسموم فضا میں تکالیف برداشت کرنے کے بعد رہائی حاصل کی تو ایسی جگہ کیوں آیا جہاں اس کی روح کے لئے مزید سامان رنج والم موجود تھا۔

اس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔

عورت نے اپنے ساتھی سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا " یہ کوئی بدمعاش ہے یا نشہ کی

حالت ہیں۔ اسے باہر نکال دو۔

مرد نے جواب دیا "نہیں کچھ بیمار معلوم ہوتا ہو۔ ہمیں سخت دل نہ بننا چاہیئے" اور یہ کہکر بڈھے کیطرف چلا تاکہ اسے ہوش میں لے آئے۔

کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں اور غصہ کے ساتھ عورت کو گھورتے ہوئے کہا "مجھے پہچان۔ میں کون ہوں۔ بے وفا عورت! تو اتنے جلدی بھول گئی۔ دیکھ میں تیرا شوہر ہوں"

عورت نے حیرت و استعجاب میں کہا "شوہر! نہیں۔ بالکل غلط۔ میں نہیں جانتی کہ تم کون ہو، میں نے اس سے پہلے تمکو کبھی نہیں دیکھا"

بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اچھا تو بتا اگر تو کملا نہیں ہے۔ تو پھر کون ہے؟"

"کملا۔ کملا۔ نہیں۔ نہیں۔ میں کملا نہیں ہوں۔ لیکن تم کون ہو۔ جلدی بتاؤ۔ کیا تم قیدی تھے۔ پندرہ برس بعد واپس آئے ہو"

"ہاں! پندرہ برس بعد۔ آخر کار تم نے مجھے پہچان لیا۔ اب سے پندرہ برس پہلے یہ مکان میرا تھا۔ یہاں کی ہر چیز میری ملکیت تھی۔ میرا ہر حکم یہاں ایک اٹل قانون تھا۔ میں یہاں کے در و دیوار سے مانوس ہوں۔ سامنے کے برآمدے میں ہر صبح میں گیتا پڑھتا تھا۔ اور تم قریب بیٹھکر سنتی تھیں۔ اسی کمرے کے اندر میں نے اور تم نے پریم کا پہلا گیت گایا۔ اور آج تم مجھ سے ناواقفیت کا اظہار کر رہی ہو۔ میری ایک چھوٹی بچی تھی۔ بتاؤ کملا وہ کہاں ہے؟"

اسکی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ وہ دوڑ کر بوڑھے سے لپٹ گئی۔

"پتاجی! ——— میرے پتاجی۔ وہ چھوٹی بچی خود میں ہوں۔"

وہ کملا نہیں تھی۔ کملا اسکی ماں کا نام تھا۔ جو مر چکی تھی۔ دونوں کے خدوخال میں بےحد مشابہت تھی یکساں۔ آنکھ، ناک۔ ہونٹ، اور تمام چہرہ ایک دوسرے سے ملتا جلتا تھا۔ سرِمو فرق نہیں تھا رہا عمر کا سوال۔ سو بصارت کیساتھ بوڑھے کی قوتِ امتیاز میں بھی کچھ فرق آگیا تھا، کملا کو وہ شباب کے عالم میں چھوڑ گیا تھا، وہی صورت اسکی آنکھوں میں پھر رہی تھی۔ اس لئے اگر وہ ہر نوجوان خوبصورت عورت کو کملا کہہ اٹھتا تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس طویل عرصہ میں بیٹی نے ماں کی جگہ لے لی ہوگی۔

آخر کار بوڑھے نے اطمینان کے ساتھ تین سسکیاں لیتے ہوئے اپنی بیٹی کی آغوش میں جان دیدی۔ اس بیٹی کی آغوش میں جس کو چند لمحے پیشتر خود اپنی شریکِ حیات سمجھ رہا تھا، اور برہم تھا کہ وہ ایک غیر شخص کے ساتھ کیوں زندگی بسر کر رہی ہے۔ حالانکہ وہ غیر شخص نہیں اس کا شوہر تھا۔

بازی گر!

رالفو ۔۔۔ مصری بازی گر ۔۔۔ کا نام ہر شخص کی زبان پر تھا، تمام شہر میں اسکے کمالات کی دھوم مچی ہوئی تھی، ضعیف الاعتقاد لوگ تو اسکے بعض کرتبوں کو معجزات سے تعبیر کرنے لگے تھے عقل میں نہ آنے والی باتیں ہمیشہ تحیر خیز ثابت ہوتی ہیں، اور یقیناً کمال اسی چیز کا نام ہے کہ ایک مرتبہ اصحابِ عقل و دانش بھی اپنے دل سے یہ سوال کرنے کیلئے مجبور ہو جائیں کہ "ایسا ہونا ممکن ہے؟" بعض نقادوں کی رائے تھی کہ وہ علمِ تنویم کا ماہر ہے اور محض اپنی قوتِ مقناطیسی سے کام لے کر ناظرین کے احساسات کو عارضی طور پر مسحور کر دیتا ہے۔ اس طرح کہ ہر شخص کو وہی چیز نظر آتی ہے، اور وہی آواز سنائی دیتی ہے جسکا تصور وہ خود اپنے ذہن میں کرے۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ گذشتہ ہفتہ کی رات میں اور کرشن بھی دم بخود رہ گئے۔

ہم دونوں دوست جب تماشا گاہ میں داخل ہوئے، تو اسٹیج کے سامنے رنگین پردہ آویزاں تھا۔ کیونکہ وقت معینہ میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔ تمام نشستیں بھر چکی تھیں اور کہیں تل رکھنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ پھر بھی شائقین کا سلسلہ کسی طرح ختم نہ ہوتا تھا، ٹھیک ساڑھے نو بجے

موسیقی کی ایک دلنواز لے کیساتھ پردہ اُٹھا۔ بوڑھا الفو اپنے مخصوص لباس میں مغربی اور طلائی تمغے آویزاں کئے ہماری نظر کے سامنے تھا۔ مختصر الفاظ میں اس نے تمام ناظرین کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور اس رات کا لائحہ عمل بتا کر پس پردہ چلا گیا۔

دوسرا پردہ اُٹھا اور اسکے کمالات کی نمائش شروع ہو گئی۔ تمام کام وہ خود کرتا تھا۔ صرف دو خواتین معمولی معاونین کی حیثیت سے شریک عمل تھیں۔ ہر کھیل کے بعد ایک منٹ کیلئے پردہ گرتا۔ اور پھر اُٹھ جاتا۔ پہلا شعبدہ ختم ہونیکے بعد ہم نے رائے قائم کی کہ شاید یہ اس بازی گر کا شاہکار ہے مگر ہمیشہ دوسرے شعبدہ نے ہماری توقع کو بدل دیا۔

تمام فضا خاموش تھی اور ہر شخص پر ایک سکوت طاری تھا۔

تفصیل اگرچہ خالی از دلچسپی نہیں مگر دقت طلب ضرور ہے۔ تاہم آخری شعبہ کو جو بلاشبہ شاہکار کا درجہ رکھتا ہے نظر انداز کر دینا ناممکن ہے۔ اس شعبدہ کو "نقاب پوش نشانہ باز" کے نام سے موسوم کیا جائے تو بہتر ہے۔ اس قسم کے کھیل سینکڑوں مرتبہ مشاہدہ میں آئے۔ مگر اس قدر مہارت کیساتھ کبھی دیکھنے نصیب نہیں ہوئے۔ کرشن تو اس درجہ متاثر ہوا کہ انتہائے استعجاب کے باعث دیر تک اسکی زبان کو جنبش نہ ہو سکی۔

پردہ اُٹھنے پر ہم نے دیکھا کہ لکڑی کا ایک قد آدم تختہ سیدھا کھڑا ہے۔ اور اسکے بالکل قریب ایک خاتون دونوں ہاتھوں کو افقی حالت میں پھیلائے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ ایک دوسری خاتون نے اسٹیج پر آکر الفو کی آنکھوں پر موم جامہ کی پٹیاں اس کثرت سے لپیٹ دیں کہ دکھائی دینے کا کوئی امکان نہ رہا۔ پھر اس بازی گر نے کمر میں کسی ہوئی پیٹی میں سے چھریاں نکالیں اور تختہ کی طرف رخ کئے بغیر

نشانے مارنے شروع کئے۔ ہر بار چھری ایک مخصوص جگہ لگتی اور نرم تختے میں پیوست ہو جاتی جتنی کہ اس خاتون کا سر ان کے درمیان محصور ہو گیا۔ اس تمام دوران میں اس نے ایکدفعہ بھی تختے کیطرف اپنے چہرے کا رخ نہیں کیا، اور نہ ایک جگہ ساکن رہا بلکہ ادھر اُدھر ٹہل کر چھریاں پھینکتا رہا۔ اسکے بعد ایک دوسری عورت نے آکران موم بتیوں کو روشن کر دیا۔ جو ایستادہ خاتون کے جسم سے بالکل قریب تختے کے چاروں طرف ترتیب سے لگی ہوئی تھیں۔ بازی گر نے پستول نکالا اور بدستور اپنی شان استغنا کیساتھ کلائی کو نصف دائرے کی شکل میں گھماتے ہوئے فائر کرنے شروع کر دئے، پستول کی ہر آواز کیساتھ ایک نئی گل ہو جاتی، یہانتک کہ ایک بھی باقی نہ رہی۔

پردہ گر گیا۔

اختتام سے قبل رالفو نے دوبارہ منظر عام پر آکر محض سر کی ایک خفیف جنبش سے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور چلا گیا۔

دوسرے دن کرشن نے کہا کہ تماشہ ایکبار پھر دیکھا جائے۔ اور ساتھ ہی مُصر ہوا کہ وقت معینہ سے ایک گھنٹہ قبل چل کر اس بڈھے بازی گر سے ملاقات بھی کیجائے۔ میرا بھی دل للچایا کہ ایسے شخص سے ضرور گفتگو کرنی چاہیئے۔ لہٰذا ہم دونوں بہت پہلے تھیٹر پہنچ گئے۔ کیونکہ رالفو اسی جگہ ایک کوٹھی میں مقیم تھا۔

ملازم کے ہاتھ کارڈ اندر بھیجے گئے۔ جسکے جواب میں ہمکو اندر طلب کر لیا گیا۔ ہمارے داخل ہونے پر رالفو نے کرسی پر سے اُٹھکر استقبال کیا۔ اور کرسیاں پیش کیں۔

کرشن نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کے کمالات کی خوبیوں کو شرمندۂ الفاظ کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ گذشتہ رات ہم دونوں موجود تھے۔ اور آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ ہال کی فضا کا سکوت، اور حاضرین کا استعجاب کیا معنے رکھتا تھا۔ فن کی صحیح تعریف کرنا ارباب فن کا حصہ ہے۔ عام لوگ محض اظہار پسندیدگی کر سکتے ہیں۔ آپکی شریک کار خاتون بھی ہر لحاظ سے تعریف کی مستحق ہے۔ ایک خطرناک ماحول میں کھڑے ہو کر مسکرانا بڑے دل و جگر کا کام ہے۔ کیونکہ بازی گر کو کتنی ہی مہارت ہو جائے۔ مگر یہ امر قرین قیاس ہے کہ ہاتھ کی خفیف لغزش معمول کی زندگی کو ختم کر دے۔"

رالفو خاموش تھا۔ اور اسکے چہرے سے حزن و ملال کے آثار ہویدا تھے۔ کرشن کی بات ختم ہونے پر اس نے کہا:۔

"آپ نے جسقدر تعریف و توصیف کی وہ جناب کا حسن ظن ہے۔ میں اس کا مستحق نہیں ہوں بہر حال اس عزت افزائی کا شکریہ۔ اب جبکہ آپ اظہار ہمدردی کر رہے ہیں۔ تو میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے دل کی دردبھری داستان آپ کے گوش گذار کر دوں۔ تاکہ ان آلام کا بوجھ کسی حد تک کم ہو جائے جو عرصۂ دراز سے میری روح پر مسلط ہیں۔ زندگی میں پہلی بار میرا یہ راز آپ پر منکشف ہوگا۔ لیکن بالکل رازدارانہ طریقے پر۔ آپ سے استدعا ہے کہ اسکو اپنے ہی تک محدود رکھیں۔ آپ کو اور شاید کسی کو بھی یہ علم نہیں ہے کہ وہ خاتون جو تختے کے قریب کھڑی ہوتی ہے خود میری شریک حیات ہے اور میں یہ کھیل صرف اسکی جان لینے کی غرض سے کرتا ہوں۔ لیکن آجتک کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ قصہ بہت طویل ہے۔ میں مختصراً عرض کرونگا آج سے پانچ سال قبل میں ایک عظیم الشان سرکس کا مالک تھا،

سینکڑوں کھلاڑی ملازم تھے۔ ہم شہر در شہر ملک بہ ملک اپنے کمالات دکھاکر دولت جمع کرتے پھرتے تھے پانچ سال ہوئے فرانس میں ہمارا قیام تھا۔ ایک روز حسب معمول کھیل سے فارغ ہوکر تبدیل لباس کی غرض سے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا ——— اُف! ——— کس زبان سے کن الفاظ میں کہوں ——— میں نے دیکھا کہ میری بیوی ایک غیر شخص کیساتھ ہم آغوش ہے۔ چونکہ میں یہ چاہتا تھا کہ ان کو اس امر کی خبر نہ ہو کہ میں انکی پوشیدہ سیاہ کاری سے واقف ہوگیا ہوں۔ اسلئے فوراً اُلٹے پاؤں باہر آگیا۔ مگر معلوم نہیں کہ کس طرح میری بیوی کو اسکا علم ہوگیا تاہم وہ خائف نہیں ہوئی۔ وہ ہمیشہ سے دلیر ہے۔ اور کسی بات کو مطلق اہمیت نہیں دیتی۔ میں نے اس روز سے آجتک اسکے سامنے اس موضوع پر گفتگو نہیں کی۔ اور نہ اپنے طرزِ عمل میں کسی قسم کی تبدیلی کی۔ البتہ ایک زبردست مگر خاموش انتقام کی تیاری شروع کردی۔ میں نے اپنی بڑھی ہوئی شہرت کو اپنے ہاتھوں خاک میں ملا دیا۔ تمام کھلاڑیوں کو برطرف کر کے سرکس کے شیرازے کو بکھیر دیا۔ اب ہم صرف تین آدمی ——— میں، میری بیوی اور ایک قابل اعتماد ملازمہ ——— تمام کھیل پیش کرتے ہیں۔ اس سانحے سے قبل ایک جاپانی خاتون تھے کے سامنے کھڑے ہوکر اس خدمت کو انجام دیتی تھی۔ جواب میری بیوی کے ذمہ ہے۔ میں اس روز سے کوشش کررہا ہوں کہ اپنی بے وفا رفیقہ کو کھیل کے دوران میں تماش بین حضرات کی نگاہ کے سامنے منظرِ عوام پر ہلاک کرکے جذبۂ انتقام کو سرد کرلوں۔ میں صدہا ذرائع سے اسکی زندگی کا خاتمہ کرسکتا ہوں۔ مگر یہ مجھے منظور نہیں۔ صرف یہی طریقہ پسند ہے۔ تعجب ہے کہ مصمم ارادہ کرلینے کے باوجود آجتک مجھ سے یہ غلطی سرزد نہ ہوسکی۔ میں دانستہ طور پر اپنے ہاتھوں کو خلاف اُصول گھماکر چھری پھینکنے اور غیر معینہ اوقات میں پستول کی لبلبی دبانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر بے سود۔

کہنہ مشقی کے باعث میرے تمام اعضا لوہے کی مشین کی طرح بے خطا کام کرتے ہیں۔ میری دیرینہ مہارت اس درجہ کمال تک پہنچ گئی ہے جب عامل سے لغزش ہونیکا امکان باقی نہیں رہتا۔ شاید آپ یقین نہ کرینگے۔ ایکدن جان بوجھ کر میں نے اپنا ہاتھ جلا لیا محض اس خیال سے کہ شاید اسکی سوزش و تکلیف سے غلطی کرنیکا موقع مل جائے۔ ایکدن سخت بخار کی حالت میں میں نے اپنا کھیل جاری رکھا۔ مگر افسوس ہے کہ میں اپنے ارادے میں ہنوز کامیاب نہ ہو سکا۔ غلطی کرنا اب میرے لئے قطعی ناممکن ہو گیا ہے۔ میری اس کمزوری کو میری بیوی خوب سمجھتی ہے۔ اور دل ہی دل میں خوش ہوتی ہے کہ مجھے اپنے اعضا پر قدرت حاصل نہیں۔ آپ نے بجا ارشاد فرمایا ہے کہ ایک خطرناک ماحول میں کھڑے ہو کر مسکرانا بڑے دل و جگر کا کام ہے۔ لیکن وہ صرف آپکے نزدیک خطرناک ہے۔ میری بیوی اس کو بچوں کا کھیل تصور کرتی ہے اس کا تبسم بھی مصنوعی ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ کوئی شخص ایک ہی کیفیت کے ماتحت ایک لمحے سے زیادہ نہیں مسکرا سکتا۔ اسکے تبسم میں ایک طنز پنہاں ہے۔ جو میرے لئے سوہان روح ہے۔ میں غم و الم کی زندگی بسر کر کے خود اپنی ہستی کو تباہ و برباد کر رہا ہوں۔ درآنحالیکہ اس بے وفا کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔ کیا آپ دونوں میں سے کوئی صاحب ایسی تدبیر بتا سکتے ہیں جس پر عمل کرنے سے میری مہارت کو ترقی معکوس حاصل ہو سکے۔ میرا فن انحطاط کے تمام مدارج طے کر کے ایسے نقطے پر آجائے۔ جہاں سوائے لغزش کے اور کچھ نہیں ہوتا۔"

"خدا آپ پر رحم کرے"۔ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا "بہتر ہے کہ آپ اس ارادے ہی کو اپنے دل سے ترک کر دیں۔ اتنی طویل مدت میں تو آتش انتقام ویسے بھی سرد پڑ جانی چاہیئے تھی۔"

"بے شک!" اس نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک نظریہ ہے کہ اسے سرد پڑ جانا چاہیئے تھا لیکن عملی دنیا میں اگر ایسا نہ ہو تب؟"

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

کرشن نے کچھ دیر سکوت کے بعد کہا۔

"اچھا! آپ اپنی شریکِ حیات سے چند لمحے ملاقات کرنیکا موقع دیجئے۔ ممکن ہے، اسکو دیکھ کر ہم کوئی مفید مطلب مشورہ دے سکیں۔"

رالفو نے کچھ ایسے انداز سے آمادگی ظاہر کی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود اس چیز کا آرزومند تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں ایک دروازے کے قریب بلا کر کہا۔

"دیکھئے! اسٹیج کے عقبی حصہ میں اس وقت بھی وہ اسی انداز سے کھڑی ہے۔ اس کا معمول ہے کہ کھیل شروع ہونے سے قبل وہ اپنے مخصوص طرزِ عمل کی مشق دہرالیتی ہے۔ تاکہ کھڑے ہونے میں خود اس سے غلطی نہ ہو جائے۔"

پھر اس نے اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"زنوبیہ! دو شریف آدمی تم سے نیاز حاصل کرنے کے آرزومند ہیں۔ چند لمحے کے لئے یہاں آجاؤ۔" اس کا رخ ہماری طرف تھا۔ وہ اسی بے پناہ شانِ استغنا کیساتھ اپنے نقرئی بازو کو افقی حالت میں پھیلائے کھڑی مسکراتی رہی۔ اور ایک قدم بھی آگے نہ بڑھایا۔

یکایک میرا دوست ایکقدم آگے بڑھا اور پھر فوراً ہی پیچھے ہٹ کر پُرغضب نگاہوں سے بازی گر کو گھورتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم مکار ہو۔ تم نے ایک گھنٹے تک اپنے فرضی افسانے سے ہمیں دھوکہ میں رکھا۔ دیکھو! تمہاری بیوی کے دائیں پاؤں پر ایک چھوٹا سا سانپ چڑھ رہا ہے۔ اور اسے خبر نہیں۔ علاوہ ازیں کھڑکیوں سے آنیوالی ہوا کے باعث دروازے کے پردے، چھت گیری کا کاغذ اور گلدستے کی پتیاں وغیرہ جنبش میں ہیں۔ مگر تمہاری بیوی کا ملبوس حرکت نہیں کرتا۔ یقیناً وہ کوئی زندہ عورت نہیں ہے۔ بلکہ مجسمۂ غیر ذی حیات ہے۔

رالفو کے چہرے کا حزن و ملال فوراً مسرت و انبساط میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"آخر کار آپ حقیقت کی تہ کو پہونچ گئے۔ اچھا! آج رات آپ دونوں اسٹیج کے ایک پوشیدہ مقام پر بیٹھ کے ہمارے کمالات دیکھیں۔ آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ ہر چیز میں حقیقت کا شائبہ کس قدر کم ہے، اور جس چیز کو آپ کمال فن سمجھتے ہیں وہ فریب نظر کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن آپ یہ راز کسی پر ظاہر نہ کریں۔ ورنہ ہماری شہرت خاک میں ملجائیگی۔ میری بیوی کے متعلق آپ نے جو کچھ سنا ہے وہ محض افسانہ ہے۔ جو میرے دماغ نے عین اسی وقت تخلیق کیا تھا۔ میں آپ کو مغالطہ میں مبتلا کر کے آپکے استعجاب کو بڑھانا چاہتا تھا۔ تاکہ آج رات جب آپ دوبارہ تماشہ دیکھیں تو ایک دوسری نوع کے تاثرات آپ پر طاری ہو جائیں۔"

سکون کی جستجو

گلفام کی بابت سب کو یقین ہو چلا تھا کہ اب اسکی زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں، اور اس دنیا میں وہ صرف چند دن کا مہمان ہے۔ اصطبل میں تھان کے سامنے لیٹے لیٹے اس کو کامل ایک ہفتہ گذر چکا تھا۔ مالک بھی اسکی خراب حالت کو دیکھتے دیکھتے تنگ آ گیا تھا، کئی بار اس نے ارادہ کیا کہ گولی کا نشانہ بنا کر اسکی تکلیفوں کو ختم کر دے۔ مگر دیرینہ رفاقت کا احساس اسے ہر مرتبہ باز رکھتا تھا۔ وہ روز اس خیال سے خاموش ہو جاتا کہ آج نہیں تو کل ضرور مر جائے گا۔ مرتے ہوئے کو مارنے سے کیا فائدہ؟

اسکی چاروں ٹانگیں بیکار ہو چکی تھیں۔ رانوں تک کا گوشت سڑ چکا تھا جب ان میں کیڑے کلبلاتے تو درد کی شدت سے وہ بھیانک آواز سے ہنہنانے لگتا۔ اکثر رات کے وقت اسکے کراہنے کی آواز سے سوتے ہوئے لوگوں کی نیند خراب ہو جاتی۔ مالک جھنجھلا کر پستول لے کے اُٹھتا۔ مگر طویلے تک جا کر رہ جاتا۔ اسے اندر جاتے ہوئے بھی کراہت معلوم ہوتی تھی۔ وہاں کی تمام فضا زخموں کی عفونت سے ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ وہ صرف جھانک کر دیکھتا، اور واپس لوٹ آتا۔ دل ہی

دل میں رائے قائم کرتا کہ کل صبح تک ضرور مر جائے گا۔

گھر کے پلے ہوئے شکاری کتے اس کے پاس آتے۔ زخموں کو سونگھتے، اور ان پر پیشاب کر کے غریب بے زبان جانور کو تکلیف پہنچاتے۔ کبھی کبھی بکرے کے سینگ بھی اسکی مجروح کھال پر عمل جراحی کی مشق کرتے، مگر وہ انتقام لینے سے قاصر تھا، رات کے وقت چوہے نکل کر اسکے کان کاٹتے گردن پر چڑھتے۔ مگر اس میں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ دُم ہلا کر ان کو بھگا دیتا۔ وہ خاموش لیٹا ہوا اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں پوری کرتا رہتا۔ مہترانی بھی اس جگہ کو صاف کرتے وقت ناک بھوں چڑھاتی، وہ کوستی کہ یہ کمبخت مر کیوں نہیں جاتا، کہ پاپ کٹے۔ وہ لید اُٹھانے سے پہلے ایک لات اسکی پیٹھ پر جڑ دیتی۔ دوسرے گھوڑوں سے بچی ہوئی گھاس اسے کھانیکے لئے ملتی تھی۔ اور وہ بھی بہت قلیل مقدار میں۔ وہ اسے بھی نہ کھا سکتا تھا۔ طویل بیماری سے اسکی بھوک پیاس بند ہو گئی تھی۔

اسکے لئے تمام دُنیا ایک اصطبل میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک ہی حالت میں لیٹے لیٹے جب اعضا تھک جاتے اور بدن میں شدید درد ہونے لگتا تو وہ کوشش کر کے زیادہ سے زیادہ کروٹ بدل لیتا۔ تاکہ عارضی طور پر کچھ سکون حاصل ہو جائے اور پس غرب و جوار کے شریر بچے دور کھڑے ہو کر اسے پتھر اور مٹی کے ڈھیلے مارتے۔ بعض بے رحم لڑکے پچکاریوں میں سرد پانی بھر بھر کر اسکی طرف پھینکتے جس سے اسکے زخموں میں مرچیں سی لگنے لگتیں۔ وہ دردبھری آواز سے ہنہناتا اور خاموش ہو جاتا۔ بچے خوش ہو کر تالیاں بجاتے اور ہنستے ہوئے چلے جاتا۔ اس کی بے بسی کی حالت پر کسی کو رحم نہ آتا تھا۔

موسم سرما کی ایک رات تھی۔ نصف سے زیادہ حصہ گذر چکا تھا اسکے زخموں کی تکلیف حد سے

زیادہ بڑھگئی۔ یہانتک کہ اسکے دل میں مصائب و آلام کے خلاف جہاد کرنے کا جذبہ پیدا ہوگیا، اپنی تمام پس ماندہ قوتوں کو جمع کر کے اس نے آخری کوشش کی اور کھڑے ہونے میں کامیاب ہوگیا، وہ کھڑا ہوگیا مگر اسکی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں جسم کا ایک ایک حصہ بید کیطرح کانپ رہا تھا اس کا بھاری جسم ان نحیف ٹانگوں کیلئے ایک بارِ گران تھا۔ مگر پوری ہمت سے کام لے کر اس نے بمشکل توازن کو قائم رکھا۔

سب سے پہلے اسکی نظر ناند پر پڑی جس میں کئی دن کی سوکھی ہوئی گھاس کا تھوڑا سا ڈھیر پڑا تھا اسکے سینہ پر سانپ سا لوٹ گیا جب اس نے خیال کیا کہ مالک اب اسکی خوراک کی بھی پروا نہیں کرتا۔ اسکے سامنے وہ منظر آگیا جب گھوڑ دوڑ کے میدان میں پہلی بار وہ اول نمبر آیا تھا۔ واپسی کے وقت ایک عروسِ نو کی طرح اسکی گردن پھولوں کے گجروں سے لدی ہوئی تھی۔ اس روز خود مالک نے اپنے ہاتھوں سے اسکی مالش کی تھی۔ اور کئی روز تک صبح و شام بالٹی بھر کر دودھ جلیبیاں اُسے کھلائی گئی تھیں۔ اس نے تھوڑی دیر کے لئے خیال کیا کہ انسان بہت قدر ناشناس اور خود غرض ہے۔ وہ پھولوں سے لطف اندوز ہو لینے کے بعد اُنہیں مسل کر پھینک دیتا ہے۔ مگر جلدی ہی اس نے اپنی رائے تبدیل کرلی کہ شاید اس مخلوق کا یہی دستور ہو کہ ہر چیز کو برت لینے کے بعد نظر سے گرا دیا جائے۔

پھر اسکی نگاہ لکڑی کے کھونٹے پر پڑی۔ جس کے ساتھ کبھی آہنی زنجیروں کے ذریعے اُسکو باندھا جاتا تھا مگر اب وہاں سن کی معمولی رسی بھی نہیں تھی۔ کیونکہ کسی شخص کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ گلفام میں چپکے سے بھاگ جانیکی ہمت ہے۔ اپنی اس بے بسی کی حالت پر اسکے آنسو نکل پڑے۔

اتنے ہی میں ایک چوہے نے بل سے سر نکال کر اپنے تیز دانت دکھائے گویا وہ اسے کاٹ کھانیکی دہمکی دے رہا ہے۔ گلفام نے چاہا کہ سم کی ایک ضرب سے اس چھوٹے سے جانور کی ہڈی پسلی ایک کر دے۔ مگر فوراً رک گیا کہ مبادا اس کشمکش میں جسمانی توازن بگڑ جائے اور اسی جگہ گر پڑے جہاں کئی دن سے بے یار و مددگار پڑا تہا۔ اس نے آخری بار اس چار دیواری پر حسرت کی نگاہ ڈالی جس کے اندر زندگی کا بیشتر حصہ گذارا تہا۔ اور لرزتے ہوئے پاؤں کو جنبش دے کر چلنے لگا۔ اسکے دونوں کولھے نجاست میں لتھڑے ہوئے تھے اور جگہ جگہ جسم پر مٹی جم کر خشک ہو گئی تھی۔

اسکی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

طویلہ سے نکلکر وہ سائیس کی کوٹھری کے قریب سے گذرا۔ جو دروازے بند کئے دنیا و مافیہا سے بے خبر گہری نیند سو رہا تہا۔ وہ رک کر ہنہنایا گویا اپنے اَن داتا کو آخری بار الوداع کہہ رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ اب میں زندہ واپس نہیں آؤنگا۔

اس نے آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ چاند اپنے پورے شباب پر تہا۔ ستارے جگمگا رہے تھے۔ موسم سرما میں چلنے والی ہوا کے جھونکے اعضا کو مفلوج کر دینے کی حد تک سرد تھے، یقیناً اس کا جسم ٹھٹھر کر رہ جاتا اگر زندہ رہنے کی آخری کشمکش کے جوش نے اس کے اندر حرارت نہ پیدا کر دی ہوتی۔ چاندنی رات میں اس سنسان مقام پر کھڑے ہو کر اس نے تصور کی آنکھ سے اپنے عہد شباب کو دیکھا۔ ایکدن وہ جوان تہا، اور چست و چالاک۔ اسکی رگوں میں تازہ خون دوڑتا تھا۔

اس کے جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ مگر سریع الزوال ۔ چار ہی قدم چلنے سے اسکا سانس پھولنا شروع ہو گیا تھا ۔ وہ باغیچہ میں سے گذرا ۔ جہاں اسکے مالک نے مختلف الالوان پھولوں کے پودے لگا رکھے تھے ۔ اس نے چاہا کہ اپنے سُموں سے سب کو روند کر فنا کر دے اور اس طرح اپنے جوش انتقام کو سرد کرے ۔

"مگر کیا فائدہ ؟"

اس سوال کے پیدا ہوتے ہی اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا ۔

باغیچہ کے ایک کونے میں مالی کی کٹیا تھی ۔ وہ رک گیا ، اور پھونس کی دیوار کے قریب اپنی آنکھ لگا کر ایک روزن سے جھانکا ، بوڑھا بے خبر سو رہا تھا ۔ اس نے ارادہ کیا کہ اسے بیدار کر کے کہے :۔

"اے پندرہ روپے کے ملازم ! اب تو مجھے ہری گھاس نہیں دیتا ۔ میں مالک سے تیری شکایت کر دونگا ۔"

مگر خود اسی کے قلب سے ایک درد بھری صدا نکلی :۔

"اے بیوقوف ! خود تیرا مالک تیری فکر نہیں کرتا ۔ اسے تیری پرواہ نہیں ۔ وہ تو چاہتا ہے کہ تو کل کا مرتا آج ہی مر جائے ، وہ تیری فریاد کو کن کانوں سے سُنے گا ؟"

چند قدم چلنے کے بعد باغیچہ کی حد ختم ہو گئی ، خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی ۔ وہ رک گیا ۔ تار زیادہ اونچے نہیں تھے بمشکل سے ڈیڑھ فٹ ہونگے کھیل کے میدان میں وہ چار چار فٹ

بلند جنگلے پر سے بآسانی چھلانگ مارتا جاتا تھا۔ مگر اب ٹانگوں میں سکت باقی نہیں تھی چھلانگ مارنا تو درکنار، راستہ چلنا بھی دوبھر تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر جسم کمزور کیوں ہو جاتا ہے؟ بدن کی طاقت کہاں چلی جاتی ہے؟ مگر یہ ایک مشکل مسئلہ تھا جس کو سمجھنے سے اسکی عقل حیوانی قاصر تھی۔

اس نے مناسب نہ سمجھا کہ ایک ہی جگہ زیادہ دیر تک کھڑا رہے۔ اس خیال سے کہ کہیں جسم کی تھوڑی بہت گرمی زائل ہو کر سردی کا احساس نہ پیدا کر دے۔ وہ پھر چل پڑا۔ حالانکہ نہیں جانتا تھا کہ اسکی کمزور ٹانگیں اس کو کہاں لئے جا رہی ہیں۔ کوئی مخصوص منزل مقصود اسکی نظر کے سامنے نہیں تھی۔ وہ کارواں سے الگ ہو کر بھٹکنے والے مسافر کی طرح تھا جس کا ہر قدم لاعلمی میں کبھی منزل کی طرف اُٹھ جاتا ہے۔ اور کبھی منزل سے دور۔

وہ جنگلے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا کہ شاید کہیں یہ سلسلہ ختم ہو جائے۔ یا ایسا مقام آ جائے جسکو عبور کر لینا اسکے امکان میں ہو۔ وہ چلا جا رہا تھا۔ اور بے خبر تھا کہ کائنات عالم کا ہر ذرہ اسکے تاثراتِ قلب کا دقیق مطالعہ کر کے اسکے ساتھ ہم آہنگ ہو جانا چاہتا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ ہر شے کا غیر مرئی دل جذباتِ ہمدردی سے مغلوب ہو کر اسکے لئے دھڑک رہا ہے

اتفاقاً ایک جگہ تار ٹوٹ جانے سے باڑھ میں ایسی جگہ بن گئی تھی جہاں سے گذر کر باغیچہ کے باہر نکلجانا اس کے لئے آسان تھا۔ وہ خوش ہوا کہ اب آزادی کی فضا میں پہنچ کر سانس لونگا۔ مگر عین اس وقت بنگلہ کی طرف سے کتے کے بھونکنے کی آواز سُنائی دی۔ وہ سہم کر کھڑا ہو گیا افشائے راز کے خوف سے اس کا تمام جسم لرزنے لگا۔ اس نے زمین کی طرف دیکھا۔ جس کی سطح پر پڑنے والا سایہ بھی کانپ رہا تھا۔ پھر اسکی نگاہ آسمان کی طرف اُٹھی۔ چاند پوری طرح روشنی پھیلا رہا

تھا۔ اس نے آرزو کی کہ کاش آج کے دن یہ قندیل فلک گل ہوجاتی تو بہتر تھا۔ مگر کسی کی آرزو کے مطابق تو نظام قدرت میں تغیر نہیں ہوتا۔ اسکے قوانین اٹل ہیں۔ اسے یقین ہوگیا کہ کتے کی آواز سے تمام چوکیدار بیدار ہوجائیں گے۔ اور سمجھیں گے کہ کوئی چور بنگلہ کی حدود میں گھس آیا ہے۔ بیشک وہ چور بھی تھا۔ کم ازکم اس کا دل چور تھا۔

اس نے اپنے ضمیر کی آواز صاف طور پر سنی۔ وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں اپنے مالک کے گھر سے فرار ہو رہا تھا۔ لازمی بات تھی کہ چاند کی روشنی میں چوکیدار اس کو باڑھ کے قریب کھڑا دیکھ لیں گے۔ اور پکڑ کر واپس لے جائینگے۔ تیز دوڑ جانیکی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس نے گذشتہ واقعات پر غور کر کے سوچا کہ کیا دوبارہ اسی مسموم فضا میں زندگی بسر کرنی پڑے گی۔ جہاں رہتے رہتے اسکی طبیعت اکتا چکی ہو ـــــ پھر وہی زندگی؟ ـــــ جس سے مرجانا بہتر ہے۔

اس نے بنگلے کی طرف دیکھا، کوئی چیز سایہ کی طرح حرکت کر رہی تھی۔ ایک چوکیدار بیدار ہوچکا تھا۔ اس نے اچھی طرح پہچان لیا۔ یکایک روشنی نمودار ہوئی۔ اور اسکی شعاع سب طرف چکر لگا کے اس کے جسم پر پڑنے لگی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انتہائے یاس میں آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن جب خلاف توقع چند لمحے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی تو اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ روشنی مفقود ہوچکی تھی۔ اور صرف ایک کتا اسکے قریب کھڑا دم ہلا رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ چوکیدار نے ارادتاً اسکی طرف سے لاپرواہی اختیار کرلی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ بلا دور ہوجائے۔ زخموں کی افراط کے باعث گلفام کی کھال بھی اس لائق نہیں تھی کہ اس سے

فائدہ حاصل کیا جائے۔ پھر اسے کون پکڑتا۔ اس خطرناک مستقبل سے بچ جانا ہی اسکے لئے باعث مسرت بن سکتا تھا۔ مگر اس امر کا احساس کہ اب اسکی ہستی کو ایک بیکا شے تصور کر کے نظر سے گرا دیا گیا ہے اسکے لئے سوہان روح بن گیا۔

اب اسکی ٹانگوں میں کوئی تکلیف باقی نہیں رہی۔ اسکے زخموں کی چیپ بند ہو گئی۔ اصطبل کی مسموم فضا کا خیال بھی اسکے ذہن سے اُتر گیا۔ مگر اسکی روح کو ایک ایسی اذیت پہنچنے لگی جو دنیا کے تمام مصائب و آلام سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔ اسکے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ کوئی آئے اور اسکو دوبارہ لے جا کر اسی گندی اور مسموم فضا میں ہمیشہ کیلئے قید کر دے۔ یہ بہتر ہے بہ نسبت اسکے کہ دنیا کی کوئی ہستی اسکو نظرِ حقارت سے دیکھے۔ وہ کھڑا دیکھتا رہا کہ اب کوئی آتا ہے۔ اب کوئی آتا ہے۔ مگر نہیں۔ کسی کو آنا تھا۔ نہ آیا۔ اسکی اُمیدیں پامال ہو گئیں۔ فضا میں کسی کا سایہ حرکت پذیر نہ ہوا۔ وہ خود اپنی ٹانگوں سے چل کر واپس جانا نہیں چاہتا تھا اسکی خودداری مانع تھی۔ ترک کئے ہوئے راستے پر خود اپنی ہی مرضی سے گامزن ہو کر ہار مان لینا اسکی شان کے خلاف تھا۔ اسکے پندار میں وہ ایک ایسا اعتراف جُرم تھا جس کا عملی پہلو بذات خود ایک زبردست جُرم ہے۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنی ہستی کو اور زیادہ گناہ آلود کرے۔ اسلئے بادل نخواستہ وہ آگے بڑھ جانے کیلئے مُڑا۔ مگر عین اس وقت اسکی نگاہ کتے پر پڑی۔ حالانکہ وہ کافی دیر سے اس کے قریب کھڑا دُم ہلا رہا تھا۔ وہ پھر ٹھٹک گیا۔ اس نے پہچان لیا۔ وہ موتی تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست رہ چکے تھے مگر اس وقت اس کا دماغ ــــــ جس کا توازن حوادث

زندگی سے بگڑ چکا تھا ——— یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ دیرینہ دوست مصیبت کے وقت بھی کام آتا ہی یا نہیں۔ ایسی صورت میں کہ خود اسکے قویٰ اسکے احکام سے انحراف کرنے لگے تھے یہ کس طرح توقع کی جاسکتی تھی کہ ایک غیر جنس ہستی اس کا ساتھ دیگی۔ اس نے سوچا۔

"کاش میرا وجود ازلی تخلیق کی ساعتوں کا رہین منت نہ بنتا۔ میری ماں مجھکو جننے سے قبل مرجاتی"

اس نے اپنی گردن جھکاکر کھوتھنی موتی کے قریب کی۔ گویا وہ اسکے کان میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر نطق سے محروم ہونیکے باعث کچھ نہ کہہ سکا۔ اور اس مجبوری کے عالم میں اس کے تمام جذبات "معنیِ بے لفظ" بنکر رہ گئے۔ موتی جھکا اور گلفام کے سموں کو چاٹنے لگا۔ اس بے زبان کے پاس بھی اظہار ہمدردی کے لئے اس سے زیادہ بہتر ذریعہ نہیں تھا۔ محبت بھرے دل کی سچی باتیں زبان سے ادا نہیں کیجاسکتیں۔ اور شرمندۂ الفاظ بنے بغیر حساس قلب کے کانوں سے سن لینی ممکن ہیں۔ وہ ایک دوسرے کا مطلب سمجھ گئے۔ موتی نے راہبری کی اور مظلوم و بیکس گلفام اس کے ساتھ ہو گیا۔

صبح کی سپیدی نمودار ہونے سے قبل وہ بمشکل ایک فرلانگ گئے ہونگے۔ کہ گلفام کے لئے آگے قدم اٹھانا دوبھر ہو گیا۔ اس کا سانس بہت تیزی سے چل رہا تھا۔ تمام جسم میں تھرتھری پیدا ہو گئی تھی۔ ٹانگوں پر کافی دیر زیادہ زور پڑنے کے باعث زخموں کے اندر سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا اور اس طرح اسکی رگوں میں سے نکلے ہوئے عزیز خون نے زمین پر ایسے نقوش پیدا

پیدا کردے کہ اگر کوئی تعاقب کرنا چاہے تو آسانی سے سُراغ ملتا چلا جائے۔ اس نے حسرت سے اپنی ٹانگوں کو دیکھا ـــــ ان ٹانگوں کو جنکی طاقت اس کو گھوڑ دوڑ کے میدان میں کامیاب بنا دیتی تھی مگر آج اسکے جسم زار کو بھی گھسیٹنے سے معذور تھیں۔ اپنی عظمت رفتہ کا خیال کر کے وہ رنجیدہ سا ہوگیا۔ اسکی کمر سینکڑوں زخموں سے داغدار تھی۔ اور جگہ جگہ نجاست لتھڑی ہوئی تھی۔ حالانکہ کچھ عرصہ قبل اس پر بندے کس کر سواری لینا انسان کیلئے باعث فخر تھا۔

اس نے دو روز سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں پیا تھا۔ اس لئے حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے۔ کچھ نہ کھانیکی وجہ سے نقاہت بڑھ رہی تھی۔ زخموں کی تکلیف سے جسم نڈھال تھا۔ زندہ رہنے کی تمنا میں مزید کشمکش کرنا اسکی طاقت سے باہر ہوگیا۔ اسکی ٹانگیں لڑکھڑائیں۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ گر پڑا۔ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ زمین بالکل پتھریلی تھی۔ چھوٹے چھوٹے سنگریزے اس کے زخموں میں گھس گئے۔ وہ تکلیف سے بلبلا اٹھا۔ مگر کوئی نہیں تھا جو ایک چمکاری دے کر اسکے درد میں کمی کرنے کی کوشش کرتا۔ اس نے دو چار لاتیں ماریں کہ شاید اس طرح بچاؤ کی کوئی صورت نکل آئے۔ مگر اُلٹا اثر ہوا، قریب کی خاردار جھاڑیاں اسکے زخموں پر نشتر زنی کرنے لگیں۔ اور پسلیوں سے لگا ہوا پیٹ لوہار کی دھونکنی کی طرح زور زور چلنے لگا۔ اس کا سانس اُکھڑ گیا۔ دونوں نتھنے خون آلود جھاگ سے بھر گئے۔ اس کا ہنہنانا بھی ایک بھیانک شور میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اسکے کراہنے کی آواز سُن کر کس کے دل میں رحم پیدا ہوتا جب کہ وہاں کوئی متنفس موجود نہیں تھا۔ اسکی تمام گریہ زاری صدا بصحرا تھی۔ اسکی آہ و بکا کو صرف ان طیور نے سُنا جو قریب کے ایک پُرانے درخت پر اپنے اپنے گھونسلوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ مگر اس کے آنے ہی سے قبل اسکی بے جا اور غیر متوقع مداخلت کو حقارت

کی نظر سے دیکھتے ہوئے اُڑ چکے تھے۔ اب صرف اس مرنے والے کی جانکنی کی آہیں خاموش فضا کے طلسم سکوت کو توڑ رہی تھیں۔ یا کبھی کبھی موتی کے بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ جو تنہائی پھیلی کیساتھ اپنے قریب المرگ رفیق کے جسم زار پر تھوتھنی رگڑ رگڑ کر اظہار ہمدردی کر رہا تھا۔

وہ بار بار اسکی ایال اپنے منہ میں پکڑ پکڑ کر گھسیٹتا۔ اسکے سُموں پر اپنے پنجے مارتا۔ مگر مریل گلفام نہیں سمجھ سکا کہ اس کا دوست اسے کہاں چلنے کیلئے آمادہ کر رہا ہے۔ اگر موتی میں سمجھ ہوتی اور اسکی پتلی ٹانگیں اس بارگراں کی حامل بننے کی اہل ہو سکتیں تو وہ یقیناً گلفام کو اپنی کمر پر لاد کر ایک ایسی فضا میں لے جاتا جہاں کوئی اسکے زخموں کو مندمل کر دیتا، وہ اسکو انسانوں کی دُنیا سے نکال کر معصوم فرشتوں کی نگری میں پہونچا دیتا جس جگہ ہر دھڑکنے والے دل میں سچی اور بے لوث محبت کا دریا لہریں مار رہا ہے جس مقام پر سانس لینے والا ہر متنفس پژمردہ پھولوں کی بھی اتنی ہی قدر کرتا ہے جتنی انکی حالتِ شگفتگی میں۔

سورج کافی طلوع ہو چکا تھا۔ کسان جھونپڑوں سے نکل نکل کر کھیتوں کی طرف جانے شروع ہو گئے۔ مویشیوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی صدا سنائی دینے لگی۔ کسی دور کے کھیت سے درانتی کی آواز بھی سنائی دی۔ شاید چنے کی فصل تیار ہو گئی تھی۔ گلفام زمین پر سُم رگڑنے لگا۔ اس نے زور سے لاتیں چلائیں، ہنہنانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی دیہاتی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلے۔ یہ لوگ بہت نیک اور ہمدرد ہوتے ہیں۔ مگر اسکی فریاد کسی کے کان تک نہ پہنچی۔ موتی بھی اپنے دوست کا منشا سمجھ کر چلانے لگا اور اتنے زور سے بھونکا کہ قرب و جوار کے دوسرے کتے بھی اس کے ہم آہنگ ہو گئے۔ کتوں کی فطرت ہے کہ اپنے ہم جنس کی آواز سن کر خواہ مخواہ

چلانے لگتے ہیں۔ گویا انہیں بھی اسکے ساتھ ہمدردی ہو۔ مگر کتوں کی زبان کو بھی کسان نہ سمجھ سکے۔ کھیت پک چکے تھے۔ اس لئے وہ اپنے کام میں پورے انہماک کیساتھ غرق تھے۔

گلفام اپنے خیالات میں محو ہو گیا۔

ایک خواب بیداری کے عالم میں کوٹھی کا منظر اسکی نگاہ کے سامنے تھا۔ تخیل کی آنکھ سے اس نے دیکھا کہ مالک اور گھر کے دوسرے لوگ بیدار ہو گئے ہیں۔ ملازم اپنے فرائض کی انجام دہی میں کمربستہ ہیں۔ سائیس سے گلفام کی حالت دریافت کی جا رہی ہے۔ وہ اطلاع دیتا ہے کہ رات کے سکوت میں وہ کہیں بھاگ گیا۔ مالک "خس کم جہاں پاک" کہہ کر قہقہہ لگاتا ہے، اور سائیس کو ہدایت کرتا ہے کہ بہت جلد مہترانی کو بلا کر اصطبل صاف کرا دے۔ اور اس میں گندھک روشن کر دے۔ تاکہ عفونت کم ہو جائے۔ اس میں سفیدی کرانے کا بھی حکم دیا جاتا ہے۔ تاکہ اس میں آئندہ بندھنے والے گھوڑوں پر برا اثر نہ پڑے۔

گلفام چونک پڑا، اسکے زخمی سینے سے ایک آہ سرد نکلی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے آسمان کی طرف آنکھیں اٹھائیں۔ اور بادل کی چادروں میں موت کے فرشتے کو تلاش کرنے لگا۔ وہ زندگی سے تنگ آگیا تھا۔ اسے مرجانے کی آرزو تھی۔

موتی بھاگ کر قریب کے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اور وہاں کھڑے ہو کر خوب چلایا۔ مگر بے سود، اس بستی کے تمام لوگ کم از کم اس دن کے لئے بہرے ہو گئے تھے۔ اسکی فریاد کو نہ سن سکے۔ وہ جلدی سے واپس آگیا۔ اس خیال سے کہ تنہائی کے ناخوشگوار لمحات میں مرنے والے دوست کو کوئی غیر معمولی صدمہ نہ پہونچ جائے۔ اس نے دیکھا کہ گلفام کے منہ پر مکھیاں بھنکنے لگی تھیں۔ اسکی زبان جبڑے کے باہر لٹک رہی تھی، آنکھیں کھلی ہوئی مگر بے نور تھیں۔ مکھیاں زخموں پر بیٹھتیں تو بدن میں تھرتھری پیدا نہ

ہوتی تھی۔ اب اسکا جسم بالکل بے حس ہو چکا تھا۔

اسکی روح کبھی کی نکل چکی تھی۔ مگر موتیؔ کو یقین نہ آیا کہ گلفام مرگیا ہے۔ وہ سمجھا کہ انتہائی کمزوری کے باعث غنودگی طاری ہو گئی ہے۔ اس لئے وہ خود بھی خاموش ہو کر زمین پر پنجے ٹکا کر بیٹھ گیا۔ اور ایک فلسفی کی طرح زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔

"کائناتِ عالم کی تخلیق سے خدا کا منشاءِ حقیقی کیا ہے؟ —— انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ کس وجہ سے دیا گیا؟ —— دیگر حیوانات نطق سے کیوں محروم رکھے گئے؟ —— مسرت و انبساط کے ساتھ مصائب و آلام کو وابستہ کر کے زندگی کو تباہ کر دینا کس مصلحت کی بنا پر ہے۔؟ —— ایسی ہستیوں کو موت جلد کیوں نہیں آجاتی جو خود اپنی زندگی سے بیزار ہوں؟ ——"

یہ اور اسی قسم کے سینکڑوں سوالات تھے جو یکے بعد دیگرے موتیؔ کے دل میں پیدا ہوئے۔ مگر اسکی عقلِ نارسا کسی ایک رمز کی بھی عقدہ کشائی نہ کر سکی۔ حتےٰ کہ آفتاب غروب ہونیکے قریب ہو گیا۔ اور موتیؔ کی توقع کے مطابق گلفام کو ہوش نہ آیا۔

وہ ابدی نیند سو رہا تھا۔

مُقدّس معصیت

اسے کس قدر فخر تھا اپنے زہد واتقاء پر۔ کتنا ناز کرتا تھا اپنی تقدیس وطہارت پر۔ سمجھتا تھا۔ کہ دُنیا سے مُنہ موڑ کر جنگل میں آجانے سے اس نے نفس پر فتح حاصل کرلی ہے۔ وہ خوش تھا کہ دنیا کی معصیت سے بچ نکلا ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے سرابِ زندگی کو بے نقاب کر کے ان حقیقتوں کو معلوم کرلیا ہے جو خوب وزشت میں امتیاز پیدا کرتی ہیں۔ اسے یقین تھا کہ اب میں نسوانی فطرت کی سحر کاریوں، حُسن وجمال کی فتنہ سامانیوں، عشق ومحبت کی کرشمہ سازیوں اور ان سب سے زیادہ شباب کے بوجھ سے دبے ہوئے ایک پیکرِ مخمور کی تقویٰ شکن انگڑائیوں کی دسترس سے کوسوں دور ایک ایسی معصوم فضا میں پہنچ گیا ہوں جہاں صرف الوہیت رقص کرتی ہے تقدس کی لَے پر، جہاں مخلوقِ سماوی کے نغمے بیدار ہوتے ہیں تاروں کی جھلملاتی آغوش میں۔

وہ راہب تھا ایک تارک الدنیا راہب۔

نمودِ سحر سے وہ چڑیوں کے دلفریب چہچہوں، آبِ رواں کی رقیق راگنیوں اور بادصبا کے نرم جھونکوں کیساتھ ہم آہنگ ہوکر اس برگزیدہ ہستی کی حمدوثنا میں محو ہو جاتا جس نے —— خود اسکے اعتقاد کے مطابق —— اسے صرف اسی مقصد کیلئے تخلیق کیا تھا۔ وہ گھنٹوں سجدہ شکر

میں پڑا رہتا۔ مالا جپتے جپتے دھوپ ڈھل جاتی اور رات کی تاریکیاں حسب معمول کائنات کے ذرّے ذرّے پر پھیل جاتیں۔ خودرو درختوں کے بدذائقہ پھل اور بہتے ہوئے دریا کا کثیف پانی ہی اسکے کام و دہن کی لذت کیلئے کافی تھا۔

ایک روز حسب معمول وہ ساحل کے قریب بیٹھا عبادت میں مشغول تھا کہ اُسے لہروں کے شگافوں میں ایک زرنگار سفینہ نمودار ہوتا دکھائی دیا۔ وہ اسکی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسکی نظریں جم گئیں، اور جم کر اس مرکز پر قائم ہو گئیں جو نسوانی رعنائیوں کا حامل تھا۔ دریا کی ہر موج کے ساتھ سفینہ قریب آتا گیا۔ یہانتک کہ ساحل کے پاس آکر ٹھہر گیا۔

اسکے اعضا پر لباس یا تو تھا ہی نہیں۔ اور اگر تھا تو محض برائے نام۔ اس قدر باریک اور ایسے رنگ کا جو اعضا کی لچیت سے وصل ہو کر جلد میں مدغم ہو جاتا ہے اور اسی کا ایک جزو معلوم ہونے لگتا ہے۔

سفینہ کے ٹھہر جانے پر اس نے ایک رباب اُٹھالیا۔ نازک انگلیوں میں جنبش ہوئی۔ اور فضا میں تاروں کی جھنکار سے ایک مترنم تموج کا تلاطم برپا ہونے لگا۔ پھر لبوں کی شگفتگی سے ان نغموں کو سنادیا جو اس وقت تک رباب کے تاروں سے بھی بیدار نہ ہو سکے تھے، راگ کے زیر و بم کے ساتھ شباب و رعنائی کے حامل سینۂ عریاں میں بھی ایسا نشیب و فراز پیدا ہوتا گویا وہ خود ایک زندہ ساز ہے جو آرزو مند ہے صرف ایک مضراب کا۔ گانے والی پر ایک محویت طاری ہونے لگی اور درحقیقت اس وقت موسیقی کا یہی اعجاز ہونا چاہیئے تھا کہ خود مغنیہ وجد میں آجاتی۔

راہب نے سب کچھ سُنا اور سنتے سنتے اسے اپنے جسم میں وہ تھرتھری محسوس ہونے لگی،

جو خون میں سرعتِ رفتار پیدا ہو جانے کے بعد نمایاں ہوتی ہے۔

اسے یقین ہو چلا کہ اگر ماحول پر سنجیدہ رہا تو آج عمرِ دراز کا تمام زہد و اتقا اس حسینہ کے قدموں میں ڈال دینا پڑیگا۔ اس لئے پوری احتیاط کی ساتھ وہ اس طرح ہمہ تن گوش ہو گیا کہ بیرونی صدا تو درکنار اسکے قلب کی دھڑکن بھی اسکی سماعت پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ لیکن اسکی آنکھیں ـــــ وہ غیر ارادی طور پر اُسی مرکز پر جمی رہیں۔

نغموں کو دوبارہ آسودۂ خواب کر کے وہ ساحل پر اس طرح اُتر آئی گویا برق کی ایک لہر ہے جس کا اضطراب متشکل ہو گیا ہے۔ وہ رقص کے انداز میں کمر کے اندر بل ڈال کر اس طرح کھڑی ہو گئی گویا کالی ناگنوں کو لہرانے کی تعلیم دے رہی ہے۔ پھر ہاتھوں کو شانوں کے متوازی کر کے ساعدِ سیمیں میں خفیف حرکت شروع کر دی، اور اسکے ساتھ ہی بائیں ٹانگ میں تھوڑا سا خم ڈال کر پاؤں کی انگلیوں سے کسی ناشنیدہ نغمے کے سروں پر تال دینے لگی۔ اس طرح کہ کائنات کے ذروں سے ہم آہنگ ہو کر بدن کا ہر رونگٹا گنگنانے لگا۔ بکھرے ہوئے بال اور منتشر ہو گئے۔ اُبھرے ہوئے مینائے شباب کو کچھ اور سرفرازی نصیب ہوئی۔ آنکھیں تھرکنے لگیں۔ بھویں مٹکنے لگیں اور بحیثیت مجموعی اس کے تمام جسم پر وہ کیفیت طاری ہو گئی جو طوفانی سمندر میں موجوں کے ہچکولوں پہ ڈگمگاتی ہوئی کشتی پہ ہوتی ہے۔ پھر وہ رقصِ طاؤس کے انداز میں پُشت کی جانب جھکی اور اتنی جھکی کہ سر زمین سے آلگا۔

اس وقت اسکے جسم کا وہ مخصوص حصّہ مکمل عریانی کے عالم میں راہب کی آنکھوں کے سامنے تھا جس کے معکوس ساغروں میں خون بھی شراب معلوم ہونے لگتا ہے۔

راہب کو اندیشہ ہوا کہ مبادا تابِ ضبط نہ رہے اس لئے اس نے منہ موڑ کر آنکھیں بھی بند کر لیں

لیکن دل و دماغ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ کیونکہ پیشانی پر پڑنے والے بلوں اور اندازِ نشست سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ منتظر ہے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اب عورت کے پاس وہ کونسا حربہ باقی ہے جسکے ذریعے اسکی اہرمنی قوتیں بروئے کار آسکتی ہیں۔

کچھ دیر سکوت طاری رہا۔

حسینہ کشتی کے قریب جا کر کھڑی ہوگئی۔ راہب نے ڈرتے ڈرتے آہستہ آہستہ آنکھیں اس طرح کھولنی شروع کیں۔ گویا نسیم صبح کے لطیف جھونکوں اور قطرہ ہائے شبنم کی صباحت سے دو غنچے بتدریج شگفتہ ہو رہے ہیں۔

یہ دیکھ کر کہ وہ کشتی میں بیٹھ کر چلے جانے کا ارادہ کر رہی ہے۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ شیطانی وسوسوں سے نجات مل گئی۔ لیکن عین اس وقت جب کہ وہ سُکّان کو پکڑ کر اندر بیٹھ جانے کی آمادگی ظاہر کر رہی تھی۔ اس نے ارادتاً اپنا توازن بگاڑ دیا۔ اور پانی میں جا پڑی۔ اپنے ہاتھوں کی بے قاعدہ جنبشوں اور ہراُبھار کیساتھ ہلکی چیخ سے اُس نے راہب کو محسوس کرا دیا کہ وہ تیرنا نہیں جانتی۔

راہب نے کچھ دیر اسکو بغور دیکھا۔ لیکن پھر یقین ہو گیا کہ ایک انسانی ہستی خطرہ میں ہے۔ اس لئے فوراً اپنی جگہ سے اُٹھا اور بے تحاشہ دریا میں کود پڑا۔ چند لمحے بعد حسینہ بیہوشی کے عالم میں اسکی آغوش میں تھی۔ اور وہ اسکو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ اسکے آنسو بھی تیر رہے ہیں، اس کا دل ہل گیا۔

اُف! ــــ حسین آنکھیں اور اشک آلود ــــ

جوشِ ہمدردی میں اس نے حسینہ کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ اور خاکستری لبوں سے اسکے

پپوٹوں پر گرم بوسے ثبت کر کے آنسوؤں کو خشک کر دینا چاہا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور اپنی اس کامیابی پر مسکرانے لگی۔

اپنی جان کو مصیبت میں پھنسا کر اور اشکوں کے تقاطر سے فریب بکر دوسروں کی ہمدردی حاصل کر لینا صنفِ نازک کا وہ آخری اور کامیاب حربہ ہے جس کے مقابلے میں تیر و تفنگ کی بھی کچھ حقیقت نہیں۔

نمودِ سحر سے قبل اس خواب بیداری کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ مناظر قدرت کی کیفیات بدستور تھیں۔ لیکن خلاف معمول دیکھا گیا کہ راہب جنگل کے گوشۂ اعتکاف کو چھوڑ کر شہر کے ہنگاموں کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت اس پر روشن ہو چکی تھی کہ صنف نازک سے منہ موڑ کر تارک الدنیا ہو جانا ایک ایسا تقدس ہے جو اپنی مذموم نوعیت کے لحاظ سے ایک زبردست معصیت ہے۔

جھوٹ

(۱)

جس طرح زرگر کو پیتل کے زیور پر ملمع کرنے کیلئے خالص سونا بھی درکار ہوتا ہے اسی طرح ایک دروغ گو کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے جھوٹ کو نبھانے کیلئے انتہائی صداقت سے کام لے اگر یہ صورت نہ ہو تو جھوٹ میں کوئی ندرت پیدا نہیں ہوتی۔ قوتِ بیان کا اعجاز کمال یہ ہونا چاہیئے کہ جھوٹی بات کو بھی سننے والے سچ اور صداقت سے لبریز تسلیم کریں۔ خواہ یہ اثر ہنگامی ہو اور بعد میں قدرت کے زبردست جھوٹ یعنی سراب کیطرح اصل حقیقت منکشف ہی کیوں نہ ہو جائے۔ عام طور پر اس فن لطیف کو مذموم سمجھا جاتا ہے اور دروغ گو کے لئے نہ صرف مذہب و ملت کی طرف سے سزا مقرر ہے، بلکہ سوسائٹی بھی اُسے مطعون کرتی ہے حالانکہ روزمرہ کی زندگی میں اور زندگی کے ہر شغل میں ہم اس کا ارتکاب کرتے ہیں اور محسوس نہیں کرتے کہ غیر ارادی طور پر ہم ایک جرم کے مرتکب ہو گئے۔

اسلاف کو اور ان کے کارناموں کو بہتر بتانا اور مقابلتاً اپنے آپ کو حقیر و کم مایہ سمجھنا کیا در حقیقت اعماقِ قلب سے نکلی ہوئی ایک آواز ہوتی ہے یا محض لبوں کی جنبش ان الفاظ کو ادا کرتی ہے؟ کسی کی جھوٹ بات سُن کر اخلاقاً اعتراض نہ کرنا بلکہ سکوت سے کام لینا کیا ایک خاموش جھوٹ نہیں ہے؟ اور کیا

صداقت اسی کا نام ہے کہ مرگِ دشمن کی خبر سُن کر محض اس لئے اظہارِ افسوس کیا جائے کہ اب وہ مرگیا ہے
یا بادشاہ وقت کی قصیدہ خوانی کیجائے صرف اس خوف سے کہ اسکا عتاب نازل نہ ہونے لگے۔

ایران کے دورانِ قیام کا ذکر ہے۔ کہ مجھے اہل تشیعہ کی ایک مجلس میں شریک ہونیکا موقع ملا اور وہاں شامل ہونے سے قبل مجھے بتایا گیا کہ سوز خوانی کے وقت خوب رونا چاہیئے اگر گریہ و زاری ممکن نہ ہو تو کم از کم رونی صورت بنا لینی چاہیئے۔ اگر آنسو نہ نکل سکیں تو منہ پر رومال رکھکر ایسی آواز نکالی جائے جو آہ و بکا کے وقت ممکن ہے۔ مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور زندگی میں پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ مذہب یا با لفاظِ دیگر مفتیانِ مذہب ہمیں جھوٹ بولنا بھی سکھاتے ہیں اور جب بہ نظر غائر مطالعہ کیا تو مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ ہر مذہب کی سینکڑوں باتیں مجموعۂ کذب و بطل ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ اگر کسی بے سر و پا قصے کو ایسے رنگ میں پیش کیا جائے جس سے قارئین کی توجہ کسی مذہبی واقع کی طرف مبذول ہو جائے تو بلا شبہ وہ بے بنیاد قصہ بیک جنبشِ قلم صداقت سے لبریز ایک حقیقت بن جائیگا۔

اس خیال کے پیدا ہوتے ہی مجھے ایک فرانسیسی افسانہ یاد آگیا جو پیرس کے ایک ظریف اخبار میں شائع ہوا تھا۔ میں نے قند مکرر کے طور پر دوبارہ اس کا مطالعہ کیا۔

(۲)

وہ موسم بہار کی ایک خوشگوار شام تھی، اور ہمارا جہاز سمندر کی پُرسکون لہروں پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میں اپنی شریکِ حیات کیساتھ عرشۂ جہاز پر کھڑا اس بحرِ ناپید اکنار کا نظارہ کر رہا تھا۔ مسرت و شادمانی سے ہمارے چہرے تو شگفتہ پھول کی طرح پُر رونق تھے۔ خاص طور پر

مجھے یہ خوشی تھی کہ ایک طویل سفر کے بعد اپنے وطن مالوف کی طرف مراجعت عمل میں آرہی تھی۔ میرا تخیل ہوا کے تیز جھونکوں سے زیادہ سریع الرفتار تھا۔ مگر افسوس ان لمحاتِ مسرت کے عین دوران میں اچانک روزا کے سینہ میں درد اُٹھا۔ اس قدر خوفناک درد کہ جہاز کے کپتان سے لیکر معمولی ملاح تک سب پریشان ہوگئے۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کیا لیکن مطلق سمجھ میں نہ آیا کہ درد کا سبب کیا ہے۔ تکلیف بڑھتی گئی اور میری یہ کیفیت تھی کہ اُسکی ہر آہ کیساتھ سینہ پر ایک کاری ضرب لگتی اور میں دل مسوس کر رہ جاتا لیکن اس سے کیا ہو سکتا تھا روزا کے درد میں کمی نہ ہوئی میں زار و قطار رونے لگا مگر قدرت کی ظالم دیوی کو بالکل ترس نہ آیا۔

نصف شب کے قریب اس کا اضطراب سکون پذیر ہوا لیکن تندرستی کی صورت میں نہیں بلکہ ڈاکٹروں نے معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ قلب کی حرکت بند ہوگئی ہے اور اسکا جسدِ خاکی ایک محروم روح نعش کے سوا کچھ نہیں ہے، مجھ پر گویا بجلی گر پڑی۔ میرے لئے دُنیا اندھیر تھی۔ وطن سے کوسوں دور پانی کی موجوں پر بہتے ہوئے جہاز میں عرصہ دراز کی شریکِ حیات کا یکایک مرجانا جس قدر اندوہناک ہو سکتا ہو اُسکے اظہار کی ضرورت نہیں۔

جہاز کے آئین کی رُو سے کپتان نے حکم دیا کہ بہت جلد مُتوفیہ کی تجہیز و تکفین کر دیجائے۔ تاکہ اصول کے مطابق نعش سمندر میں پھینک دیجائے زیادہ عرصہ اسکو جہاز میں رکھنا خلاف قاعدہ ہے، ہر چند میں نے استدعا کی کہ بندرگاہ پہنچنے تک کی مہلت دیدی جائے تاکہ میں اپنی شریکِ حیات کو زمین میں دفن کر کے ایک یادگار قائم کر سکوں۔ لیکن کپتان نے میری بات نہ مانی۔ اور اسی پر مُصر رہا کہ نعش پانی میں ڈال دیجائے۔

مجبوراً بادلِ ناخواستہ میں نے نعش کو اسکے بہترین لباس میں لپیٹ کر ایک اُونی کمبل میں باندھ دیا۔ دستور کے مطابق کچھ وزنی پتھر بھی ساتھ رکھدیے تاکہ نعش جلدی ڈوب جائے لیکن جب لوگ اسے پانی میں ڈالنے لگے تو ضبط و تحمل کی باگ میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی، اور میں نے تہیہ کرلیا کہ اسکے بعد زندہ رہنا فضول ہے۔ موت کا سبب یکساں نہ سہی۔ تاہم مٹی دونوں کی ایک ہی طرح ٹھکانے لگجائے تو بہتر ہے۔ اسلئے فوراً چھلانگ مار کر نعش ہی کے ساتھ میں خود بھی پانی کی موجوں پر جاگرا۔ وزن زیادہ ہونے کے باعث وہ بڑی سرعت سے تہہ میں بیٹھتی جارہی تھی۔ اسلئے میں نے زبردست تعاقب سے کام لیا اور اُسے پکڑنے کی کوشش برابر جاری رکھی اچانک میرا سر کسی شے سے ٹکرایا اور میں نے محسوس کیا کہ کسی محدود جگہ میں گھر گیا ہوں بلکہ مقید ہوں کیونکہ اب میں پانی کی موجوں کے بجائے ایک ایسے مقام پر تہا جہاں معمولی نمی تھی۔ ورنہ زیادہ نشیب و فراز کی سی بنجر زمین معلوم ہوتی تھی، سخت اندھیرا تھا کوئی چیز نظر نہ آتی تھی سانس بھی کسی قدر گھٹ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے ہمت سے کام لیا اور اِدھر اُدھر ہاتھ بڑھا کر ٹٹولنا شروع کیا یہ معلوم کرنے کیلئے کہ وہ جگہ کس قسم کی ہے کہ اچانک میں نے اسی کمبل کو محسوس کیا جس میں روزا کی نعش لپیٹی گئی تھی۔ مجھے ایک گونہ اطمینان ہوگیا کہ خیر اُس کے قریب ہوں۔ انجام جو ہو سو ہو۔

میں اُس کے پاس بیٹھ کر خود اپنی موت کا انتظار کر رہا تھا کہ یکایک روشنی کی ایک شعاع ایک سمت سے نمودار ہوئی اور اس کے ساتھ ہی کچھ شور سُنائی دیا۔ اس وقت بچشم خود میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑی مچھلی کے پیٹ میں ہوں۔ اس وقت مجھے آسمانی جھلک بھی نظر آئی

جس سے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ مچھلی سانس لینے کیلئے سطح پر آئی ہے۔ کچھ دیر بعد پھر اندھیرا ہوگیا، وہی اندھیرا اور میں افسردہ وغمگین اپنی شریک حیات کی نعش سے لپٹ کر رونے لگا۔

مجھے محسوس ہوا کہ اس مردہ جسم میں خفیف سی حرکت ہو رہی ہے۔ پہلے گمان ہوا کہ یہ اپنے وہمہ کا کرشمہ ہے لیکن جب وہ جنبش بڑھتی گئی تو مجھے یقین ہونے لگا کہ روزآمری نہیں تھی۔ بلکہ صرف سکتہ ہوگیا تھا اور اب وہ دوبارہ ہوش میں آرہی ہے۔ میرا یقین واثق ہوگیا۔ جب ایک نحیف آواز "میں کہاں ہوں؟" مجھے سنائی دی۔ میں نے کہا "روزآ تم میرے قریب ہو۔ ڈرومت"۔

اس سے قبل میں مرجانا چاہتا تھا لیکن اب زندہ رہنے کی تمنا پیدا ہونے لگی لیکن کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی تھی سوچتے سوچتے خیال آیا کہ میری جیب میں ایک چاقو ہے اس سے کام لینا چاہیے فوراً اُسے نکالا اور سب سے پہلے اس رسی کو کاٹا جس نے روزآ کو جکڑ رکھا تھا۔ وہ بالکل آزاد ہوگئی اور زندہ بھی میں نے جوش محبت میں اس کو سینہ سے لگالیا اور اسکے لبوں کو جن میں دوران خون کے شروع ہوجانے سے حرارت پیدا ہوچلی تھی۔ بیتابی کے ساتھ چومنے لگا، تاہم میں نے اُس کو یہ نہیں بتایا کہ ہم ایک خطرناک قیدخانہ میں بند ہیں۔

معمولی چاقو سے مچھلی کے جسم کو چیر کر باہر نکل آنا غیر ممکن سی بات تھی۔ کیونکہ ظاہر تھا کہ اسکا گوشت نہایت سخت ہے اور کھال دبیز ہوگی، اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ اُسکے دل کو زخمی کرکے اُسے ہلاک کردیا جائے اور پھر باہر نکلنے کی تدبیر کیجائے۔ لیکن دل کہاں اور کس جگہ ہے؟ یہ معلوم کرنا مشکل تھا۔ کیونکہ اس قدر وسیع اور تاریک جگہ میں یہ پتہ نہ لگ سکا کہ بایاں پہلو کونسا ہے۔ لہذا میں نے محض اندازہ سے کام لیکر تلوار کے سے ہاتھ چلانے شروع کردئیے اس خیال سے کہ کوئی نہ کوئی ضرب

تو کاری لگ ہی جائیگی۔ میرا کوئی وار خالی نہیں گیا۔ مگر پھر بھی بے سود۔ میرے قویٰ مضمحل ہو گئے۔ پسینے کے باعث بُرا حال تھا۔ علاوہ ازیں اس محدود فضا میں ایک قسم کا تعفن بھی پیدا ہو چلا تھا۔ جس سے دم گھٹنے لگا۔ لیکن زندہ رہنے کی تمنا کسی تکلیف سے پامال نہیں ہو سکتی تھی۔ انسان آخری سانس تک جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ میری کوششیں کامیاب رہیں اور مچھلی کچھ تڑپنے کے بعد بالکل مُردہ ہو گئی۔

اسکے بعد کیا ہوا؟ کچھ علم نہیں، البتہ جب ہوش آیا تو میں ساحل پر تھا کیونکہ ماہی گیروں نے ایک بڑی مردہ مچھلی کو سطح پر تیرتے ہوئے دیکھا، تو اُسے خشکی پر کھینچ لائے اور چربی وغیرہ نکالنے کیلئے جب پیٹ چاک کیا تو ہم برآمد ہو گئے۔ روزا بھی زندہ و سلامت رہی۔"

(۳)

افسانے کو دوبارہ پڑھ لینے کے بعد میں نے غور کیا کہ طرزِ بیان اگرچہ دلکش ہے مگر صداقت کا فقدان صاف ظاہر تھا کوئی شخص یقین نہ کرتا کہ یہ واقعہ ہو سکتا ہے۔ میں نے خیال کیا کہ ایک معمولی سی ترمیم سے اس مردہ ڈھانچ میں جان پڑ سکتی ہے۔ لہذا اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کر نیکے بعد اختتام سے قبل ان الفاظ کا اضافہ کر دیا۔

"مچھلی کے پیٹ میں رہکر دوبارہ زندہ نکل آنے کے باعث لوگ مجھکو یونس ثانی کہنے لگے۔"

نتیجہ ظاہر ہے کہ اس آخری جملے کا مطالعہ کرکے قارئین کو حضرت یونسؑ کا واقعہ یاد آجاتا۔ اور وہ اسی فرضی افسانے کو حقیقت سمجھنے لگتے۔ کیونکہ ان کے ذہن پر اچھی طرح مرتسم تھا کہ حضرت یونسؑ تین یوم تک مچھلی کے پیٹ میں رہے اور پھر زندہ نکل آئے۔ اسی طرح اور صدہا جھوٹے واقعات کو ہم صداقت کے رنگ میں پیش کر سکتے ہیں۔ ✢

بنگالی ادب اور ایک گمنام شاعرہ

کسی ملک کی حیاتِ قومی کا مطالعہ کرنے کیلئے جن پہلوؤں کو مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے ان میں سے ادبیات کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ادب کے ذریعے انسان کی انفرادی اور اجتماعی دونوں ذہنیتوں کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ قوم لائق نفریں ہے جسکے ادبیات میں ہر قسم کا رطب و یابس موجود ہو۔ غائر نظر سے دیکھا جائے تو تسلیم کرنا پڑیگا کہ کم از کم عصرِ جدید میں خوب و زِشت کی بیشتر ذمہ داری ان حاملانِ ادب پر عائد ہوتی ہے جو رسائل ادبیہ کے مدیر یا دار التصنیف کے ناظم و ناشر ہیں۔ اعتراض ہو سکتا ہے کہ موردِ الزام یا لائق تحسین ان ہستیوں کو کیوں ٹھیرایا جائے۔ جن کی نگارش کاغذ پر کثیف یا لطیف نقوش پیدا کرتی ہے۔ یہ صرف اس حد تک درست ہے کہ ادب شخصی تخیلات، جذبات، اور احساسات کا پرتو ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ انکی کاوش دماغی انہی حاملانِ ادب کی فرمائشات اور ذوق کی بلندی و پستی کے تابع ہوتی ہے۔

تخلیق ادب کے اس عمیق نکتہ پر غور کرنے سے پہلے اس امر کو سمجھنا ضروری ہے کہ ہر ادب میں دو عناصر پائے جاتے ہیں — پہلا اکتسابی یا ارثی کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ عنصر ہے جو ایک فاتح قوم مفتوح قوم کیلئے یا ایک نسل دوسری آنیوالی نسل کیلئے بطور ورثہ چھوڑ جاتی ہے۔

مثلاً یورپ میں یونان کا ادب روم کو ملا، یا ہندوستان میں ایرانی اور بعد میں انگریزی ادبیات کے نقوش یہاں کے لوگوں کے دل و دماغ پر مرتسم ہو گئے۔ ایسی صورت میں اسلوب بیان کے اندر تصنع اور آورد کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اور صداقت و سادگی کا فقدان۔ جذبات کے بجائے غیر فطری لباس میں نظر آتے ہیں۔ استعارے اور تشبیہات بھی مانگے کے ہوتے ہیں۔

دوسرا عنصر وہ ہے جسے طبعی کہا جا سکتا ہے۔ یہ رنگ صرف اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کہ ذاتی ماحول کے مطابق اور خالص انفرادی تاثرات کے بموجب اپنے جذبات کی ترجمانی دل سے کیجائے۔ اسکے ذریعے ہم کائنات کے پوشیدہ راز معلوم کر کے دوسروں کو سمجھا دیتے ہیں۔ اور نہ مٹنے والے نقوش کی طرح ہمیشہ کیلئے چھوڑ جاتے ہیں۔

اس وقت ہندوستان میں مختلف زبانوں کے بے شمار رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ اور ہر سال سینکڑوں کتابیں تصنیف ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی ایک کو بھی خالص ہندوستانی پیداوار نہیں کہا جا سکتا۔ ایک اردو ہی کو لیجئے۔ ایرانی رنگ تغزل اور انگریزی طرز فسانہ نویسی اس درجہ حاوی ہے کہ اگر کوئی طبعزاد چیز بھی لکھی جائے تو اُسے طبعزاد ثابت کرنا مشکل ہو جائیگا۔

تاہم بنگال ایک ایسا صوبہ ہے جس کو اس کلیہ سے مستثنےٰ کیا جا سکتا ہے جسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابتدا ہی سے اس کا خزینۂ ادب اس قدر بھر پور تھا کہ بیرونی بھیک کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اور اگر کسی نے نذرانہ پیش بھی کیا تو خوددار طبیعت نے اسکی اثر آفرینی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس وقت بھی جب کہ یہاں انگریزی معاشرت کے جراثیم بکثرت موجود ہیں۔

وہ اپنے شعار قومی اور روایاتِ ملکی پر قانع ہے۔

علاوہ ازیں زبان کی نزاکت، اسکے فطری لوچ اور قدرتی فضاؤں کے لحاظ سے بھی بنگال خوش نصیب ہے۔ ہر شاعر اور ہر افسانہ نویس اپنے صحیح جذبات کو حقیقی رنگ میں بیان کرنا فرض اولین سمجھتا ہے۔ اسی لئے اس میں حد درجہ بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔ شاعری کے ضمن میں اگر کبھی محبوب کو یاد کیا گیا تو بالکل اس طرح گویا وہ سامنے موجود ہے۔ اسی طرح افسانے کے واقعات آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی تصویریں معلوم ہوتے ہیں۔ مرد عورت کو یاد کر کے خون کے آنسو بہاتا ہے اور عورت مرد کے فراق میں جاں بلب نظر آتی ہے۔ اُردو کیطرح نہیں کہ محبوب کی ہستی کو ہر صورت میں صنف قوی سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

شاعری کے لئے آلام حیات اور آرزوؤں کی پامالی بہت ضروری چیز ہے اسکے بغیر صحیح جذبات بیدار نہیں ہوتے۔ مرد اپنے غمگین دل کی افسردگی کو سینکڑوں ذرائع سے محو کر سکتا ہے۔ یار دوستوں کی بے تکلف محفل میں اٹھ بیٹھ کر، مختلف تفریحات میں حصہ لے کر، اقتصادی مشاغل میں منہمک رہ کر، وہ ان کلفتوں کو جلد ہی بھول جاتا ہے۔ جو اسکی روح کے لئے بارگراں بنتی ہیں۔ برخلاف اسکے صنف نازک کے لئے جس کی ہر آزادی پر بھی سینکڑوں پابندیاں عاید ہوتی ہیں مقسوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے جذبات کو سینہ ہی میں پرورش کرے۔ اور کبھی انکی تسکین کا خیال بھی نہ کرے چنانچہ میں سمجھتی ہوں کہ ایک عورت کے اعماق قلب سے نکلے ہوئے گیت یا اس کے قلم سے لکھے ہوئے ایک افسانے میں جتنی صداقت ہو سکتی ہے۔ مرد کے ہاں ممکن نہیں۔

اسی لئے میں نے ان سطور کو ایک خاتون کی شاعرانہ شخصیت کے لئے مخصوص کیا ہے

سُربالا دیوی ——— میرے وطن عزیز کی بے مثل شاعرہ جسکا پاکیزہ کلام ہر ملک کیلئے ایک نمونۂ ادب بن سکتا ہے۔ اس قدر گمنامی کے پردہ میں زندگی بسر کررہی ہے۔ کہ خود بنگال کے بڑے بڑے ادب نواز طبقوں میں اس کا نام تک سننے میں نہیں آتا جس زمانہ میں یہ شانتی نکیتن کے اندر موسیقی کی تعلیم حاصل کررہی تھی مجھ سے ملاقات ہوئی ——— نہایت متین و سنجیدہ، کم سخن، اور آنکھوں میں ایک وحشت سی تھی، پہلے تو میں اسکی فطرت سمجھ ہی نہ سکی۔ خیال ہوا کہ شاید دیوانی ہے، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اسے مطالعۂ قدرت کا بیحد شوق ہے، بارہا میں نے دیکھا کہ موسمِ سرما کی بہتے ہوئے پانی کو منجمد کردینے والی خنک راتوں میں وہ صحن چمن میں بیٹھی ماہ و انجم سے ہمکلام ہے جس دن چاند پورے شباب پر ہوتا وہ اکثر قریب کے ایک چشمے کے کنارے اپنا رباب لے کر چلی جاتی، اور سکوتِ شب کو اپنے دلنواز نغمے سنا کر بیدار کردیتی۔ یوں دوسرے شعراء کا کلام بھی اسے یاد تھا، مگر عموماً اپنی ہی غزلیں گاتی تھی۔ وہ مجھ سے کہا کرتی تھی کہ حقیقت نگر آنکھیں قدرت کی جمال آفرین کیفیتوں میں اس حسن کا مطالعہ کرسکتی ہیں جو ایک شاہدِ رعنا کے ظاہری خد و خال یا خود داری ناز و انداز میں کبھی ممکن نہیں۔

ایک رات کا منظر وہ ان الفاظ میں پیش کرتی ہے۔

"میں ایسے سمے کو کبھی نہ بھولوں گی۔

جب ٹھنڈے چشمے کی سنجیدہ روانی میں مدہم سروں کا باجا بجتا تھا۔

جب سرد ہوا کے ہلکے جھونکوں سے،
ننھی شاخوں پر سبز پتے رقص کرتے تھے۔
جب سرمئی رنگ کی کہر کے دھندلے پردوں سے،
چاند کی سنہری کرنیں چھن چھن کر آتی تھیں۔
جب بھیانک جنگل کے سکوتِ مطلق میں،
وحشی درندے خم ٹھونک کر چلاتے تھے۔
جب خنکی و دہشت کے اس ہوش رُبا عالم میں،
مجھے پرمیشور آ کر تسکین دیتے تھے۔
میں ایسے سمے کو کبھی نہ بھولونگی۔"

بچپن اور بچپن کی بے فکری کا زمانہ اور اس زمانے کی معصومیت مرتے دم تک یاد آتی ہے۔ اس کھوئے ہوئے عہدِ زرین کا نوحہ ہر شخص کی زبان سے سن لو۔ لیکن صنفِ نازک جس نرالے انداز میں اس کو یاد کرتی ہے، وہ اسی کا حصہ ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار سربالا دیوی اپنی مندرجہ ذیل نظم کو گاتے گاتے خود رونے لگی تھی۔ (ترجمہ میں وہ خوبی کہاں جو اصل میں ہے۔)

"وہ کیسا پیارا پیارا بچپن کا زمانہ تھا۔
نہ کوئی فکر، نہ غمگین جذبات کا ہجوم۔

میرا دل رنج و غم کا مرکز بن جاتا ہے۔
جب مجھے پچھلی باتیں یاد آتی ہیں۔
گھر کے کُل دھندوں سے فارغ ہو چکنے پر
سہیلیوں کی سنگت میں میں کھیلا کرتی تھی۔
ان کی شرارت سے دل جل جاتا تھا۔
(لیکن) اس جلن میں لذت ہوتی تھی۔
چاندنی راتوں میں ندی کے کنارے پر،
رنیلی مٹی کے محل سب مل کے بناتے تھے۔
ایک رانی بنتی، چند سکھیاں، ایک داسی،
پھر راجہ کے بنانے میں جھگڑا ہوتا تھا۔
ایک کہتی میں بنوں، دوسری کہتی میں بنوں۔
کوئی منہ پھلا کر رہ جاتی، کوئی روٹھ کر چل دیتی
لیکن روز کا کھیل بدستور ہوتا، اور سب شامل ہوتیں۔
لڑ پڑنا آپس کا، پھر مل جانا آپس میں،
کیسا پیارا پیارا بچپن کا زمانہ تھا۔"

میں سمجھتی ہوں کہ اس بے مثل شاعرہ کا معصوم دل بھی ننھے کام دیو (کیوپڈ) کی کمان

سے نکلے ہوئے کسی تیر سے چھلنی ہو چکا ہے۔ بسا اوقات محض چھیڑنے کی غرض سے اور کبھی کبھی سنجیدہ طور پر میں نے پوچھا بھی کہ کہیں مرضِ محبت تو تمہیں لاحق نہیں ہو گیا۔ لیکن ہر بار میرے استفسار کے جواب میں سوائے مسکرا دینے کے زبان سے کوئی لفظ نہیں کہا۔ اس لئے کم ازکم مجھے یقین ہے کہ اگر وہ تبسم خفی کسی روز تکلم بلیغ بن گیا۔ تو دُنیا کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ اسکے یہ چند اشعار اسکے ذاتی تاثرات کا نتیجہ ہیں۔

"اے عشق! اے بربطِ قلب کے سب سے بلند (آہنگ) نغمے۔
تو پیغامِ سروش ہے ناامید زیست کے لئے۔
(تجھ میں) لذتِ غیر فانی ہے بیداریِ روح کی،
تیرا ہی ذوقِ نظر ہے دیدۂ عبرت بیں میں۔
تو کاشفِ فطرت ہے عقدۂ لاینحل کا۔
حسن سربسجدہ ہے تیری بارگاہ میں،
آسمانی پریاں تیرا گیت سُننے کیلئے ہمہ تن گوش ہیں۔
ہاں گا! اور گائے جا! اے عشقِ نغمہ نواز۔"

مختلف آلامِ حیات، ہر وقت کی وحشت و بے چینی اور مسلسل اضطراب، انسان کو عارضی طور پر اہلِ دُنیا سے بیزار کر دیتے ہیں۔ اور وہ مجبوراً گوشۂ تنہائی کو پسند کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر تمناؤں کی شکست کا سلسلہ جاری رہے تو وہ دِل برداشتہ ہو کر قدرت کے خلاف جنگ

کرنے کیلئے آمادہ ہو جاتا ہی، اور لا مذہبیت کے سوگوار دامن میں پناہ لینی پڑتی ہی۔ سُر بالا دیوی پر بھی ایک بار یہ کیفیات طاری ہوئی تھیں۔ لیکن نفسیات کے ایک دقیق پہلو کو جس سادگی کے ساتھ بیان کیا ہے وہ تعریف سے مستغنی ہے صرف ایک شعر کا مفہوم یاد ہے۔ کہتی ہی:۔

"جب دل میں آرزوؤں کا ایک طوفان برپا تھا تو دعا مانگنے کے لئے ہاتھ اُٹھ جاتے تھے۔ آرزوئیں پامال ہو چکیں اس لئے اب خدا کبھی یاد نہیں آتا۔"

ایک اور شعر میں کہتی ہے۔

"کبھی کبھی تمناؤں کا پامال ہو جانا بھی اشد ضروری ہے۔ ورنہ خدا کی شانِ قہاری کو ثابت کرنا دشوار ہو جائیگا۔"

اس قسم کے انقلاب انگیز خیالات بنگال کے مشہور شاعر نذر الاسلام کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔ اور اسی لئے ان کو بجا طور پر باغی شاعر کا خطاب دیا گیا ہی کبھی آئندہ فرصت میں انکی شاعری پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرونگی۔

ہر چند بنگالی زبان میں الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ ایک ہی مفہوم کو کئی کئی لفظوں سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہی کہ جب جذبات و احساسات کا ہیجان ناقابل بیان حد تک بڑھ جاتا ہی تو دنیا کی کسی زبان میں ان کا اظہار آسان نہیں۔ خدا جانے سُر بالا دیوی پر ایک مرتبہ کس نوع کے جذبات طاری ہوئے کہ وہ ان کو الفاظ میں ظاہر کرنے سے قاصر رہ گئی کہتی ہے ؎

"آج میرے سینے کے نیچے ایک نامعلوم درد پیدا ہو رہا ہے۔

دل میں کبھی نہ گھٹنے والا جوش زلزلہ انگیز ہے۔

میں کچھ کہنا چاہتی ہوں (لیکن) کہہ نہیں سکتی۔

آج اپنے الفاظ کی تنگ دامانی مجھ پر ظاہر ہو گئی۔

انسان مجبورِ محض ہے۔ پھر منصوبے بیکار۔

قدرت جو چاہتی ہے ہو کر رہتا ہے۔

کاش! آج میری زبان برق گیر بن جائے۔

اس میں صاعقہ ریزی کی قوت پیدا ہو۔

میرے دہنِ قلم سے آتشباری ہونے لگے۔

اپنے مشتعل جذبات کو تحریر میں مقیّد کر دوں۔

لیکن خوب سمجھتی ہوں یہ کبھی نہیں ہو گا۔

دل کی ٹیسیں رہ رہ کر بڑھتی جاتی ہیں۔

آج رو کر آنسو بہانے سے بھی قاصر ہوں۔

آہ! آنکھوں کے چشمے! تیری تنگ ظرفی۔

نغماتِ سوزت کے بول تک یاد نہیں آتے۔

اظہار کی ساری قوتیں کس نے سلب کر دیں؟

لیکن نہیں۔ میں خاموش رہوں گی۔ بالکل خاموش۔

میرا سکوتِ مطلق ہی شرحِ بسیط بن جائیگا"

واہ! سکوتِ مطلق کو شرحِ بسیط لکھنا کتنا بلند اور فلسفیانہ تخیل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شاعر جیسے بجا طور پر لسان الغیب کا خطاب دیا گیا ہے۔ ان رموز کی عقدہ کشائی کر لیتا ہے جو عام انسانوں کی فہم و ادراک سے دور ہوں۔ اس موقعہ پر مجھے ایک اُردو شعر یاد آگیا۔ (شاعر کا نام یاد نہیں) ؎

اسے صیاد نے کچھ، گُل نے کچھ، بلبل نے کچھ سمجھا
چمن میں کتنی معنی خیز تھی ایک خامشی میری

سرَبالا دیوی نہایت اعلیٰ خاندان کی شریف النسب خاتون ہے۔ اسکے والد نِرَن چندر چیٹرجی جنکو کلکتہ یونیورسٹی نے ڈی، او، ایل کی اعزازی ڈگری دی تھی فارسی زبان کے بہت بڑے عالم تھے۔ حتیٰ کہ اس زبان میں اپنا کچھ کلام بھی چھوڑا ہے۔ اس لئے وراثتاً باپ کا ذوق بیٹی کو ملا، اور وہ بھی فارسی زبان کی لطافت و شیرینی سے محروم نہ رہی۔ عمر خیام کا کلام اسے خاص طور پر پسند ہے۔ اور حافظ کے بعض اشعار بھی ازبر تھے۔

ایک مرتبہ میں نے اسکو نہایت پریشان حالت میں دیکھا۔ سر کے بال اُلجھے ہوئے چہرہ خاک آلود۔ پھٹے پُرانے کپڑے، ایک راہبہ کی صورت بنائے دریا کے کنارے بیٹھی بنسی بجا رہی تھی۔ جب میں قریب پہنچی تو اُس پر ایک وجد طاری تھا۔ اس لئے کچھ دیر ایک طرف خاموش کھڑی رہی۔ لیکن دِلی عقیدت کے باعث زیادہ عرصہ تک تاب نہ ہو سکی۔ اور وفورِ جوش میں اس سے لپٹ گئی۔ اسکے لبوں میں ارتعاش تھا۔ اور آنکھیں اس قدر سُرخ تھیں گویا

شراب پی رکھی ہے۔ میں نے اسکے حسب و نسب کا ذکر کرکے اس کو متوجہ کیا کہ اس زدہ حالت میں ہنا زیبا نہیں۔ اس نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ اسکی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ کچھ دیر بعد بولی۔

"میں یہ سب کچھ جانتی ہوں۔ کہ ؎

صوفی صومعۂ عالم قدسم لیکن حالیہ دیر مغانست حوالت گاہم

اسکی عمر تقریباً ۲۳ سال ہے۔ ابھی تک اس نے شادی نہیں کی۔ لیکن نہایت تقدس کی زندگی بسر کر رہی ہے اور کسی کو آجتک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اسکی بیخودی کا اصل سبب کیا ہے۔ اس کا کلام بہت زیادہ نہیں ہے۔ لیکن جو کچھ بھی ہے عمدہ اور قابلِ وقعت ہے۔ میں کوشش کرونگی کہ کسی طرح اسے حاصل کرکے کتابی صورت میں مجتمع کردیا جائے۔ اور اگر ممکن ہو سکے تو دوسری زبانوں میں بھی منتقل کردیا جائے۔

سوتیلے بچے

حسنہ صرف اٹھارہ ماہ کی معصوم بچی تھی جب کہ وہ اچانک یتیم ہوگئی۔ باپ جو کچھ چھوڑ کر مرا تھا۔ وہ اسکے اور بیوہ کیلئے کافی تھا۔ اور غالباً اسکی ماں کو دوسری شادی کی ضرورت لاحق نہ ہوتی۔ مگر ایک اور بچے کی ولادت نے جس کی پیدائش کے آثار باپ کے انتقال سے تین ماہ قبل ہی شروع ہوگئے تھے۔ واقعات میں گہرا تغیر رونما کردیا۔ لڑکی کو خانگی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کیلئے معمولی گھریلو تربیت کافی ہوسکتی تھی۔ اور اسکے بعد وہ کسی دوسرے کی شریک حیات ہوکر اپنا بار غریب ماں کے شانوں سے ہٹا دیتی۔ لیکن جمال کی لڑکا تھا۔ اسے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت تھی تاکہ جوان ہوکر وہ خود کوئی ذریعہ معاش نکالے۔ اسکی شادی ہو، اور اس طرح وہ نہ صرف اپنا پیٹ پالے، بلکہ دوسروں کا بوجھ بھی اُٹھا سکے۔ اثاثہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ وہ تمام اخراجات اس سے پورے ہوجاتے۔ اور یوں بھی عورت ہزار قابل اور تربیت یافتہ ہو مگر مرد کی سرپرستی کے بغیر ایک بچے کی تعلیم کماحقہ نہیں ہوسکتی۔

یہ تھی وہ مجبوری جس نے جمیلہ کے دل میں دوسری شادی کا خیال پیدا کردیا۔ ڈاکٹر

ذات کیلئے کسی قسم کے آرام و آسائش کی متمنی نہیں تھی۔ اور اگر ایسا ہوتا تب بھی کوئی عیب کی بات نہیں تھی۔ اس نے دُنیا میں دیکھا ہی کیا تھا۔ ازدواجی زندگی کے صرف دو سال گذارے تھے۔ کہ بیوہ ہوگئی۔ وہ جوان تھی، اور خوبصورت بھی۔ مگر اسے اپنے سے زیادہ بچوں کا خیال تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی ایسے شخص سے رشتۂ مناکحت قائم کیا جائے جو اس وقت تک یا تو مجرد رہا ہو۔ یا پہلی بیوی سے اسکی کوئی اولاد نہ ہو۔ تاکہ اسکے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہونے پائے۔

آخر کچھ عرصہ کے بعد جمیلہ اپنے دور پرے کے ایک رشتہ دار رشید کی شریکِ حیات بن گئی جسکی شرافت اسکے طرزِ عمل سے ظاہر تھی۔ باوجود سوتیلا باپ ہونیکے وہ ان یتیم بچوں کو بالکل اس طرح پیار و محبت کیساتھ رکھتا گویا وہ خود اسکے بچے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں تھے کہ وہ صرف انہی دو بچوں کا سرپرست رہنا اپنے لئے کافی سمجھتا۔ اور انکی خاطر خود اپنے سلسلۂ نسل کو منقطع کر دیتا۔ لہذا یہ جمیلہ کی غلطی تھی۔ کہ اس نے یہ محسوس کرنیکے بعد کہ وہ ایک مزید بچے کی ماں بننے والی ہے۔ مغموم رہنا شروع کر دیا۔ اور یہ احساس اس کے لئے اس قدر سوہانِ روح ثابت ہوا کہ اس کا نخلِ حیات ثمر بار ہونے سے قبل ہی خزاں رسیدہ ہوگیا۔ وہ بسترِ مرگ پر تھی۔ جانکنی کا عالم تھا کہ عین ان لمحات میں اس نے اپنے عزیز شوہر کو پاس بُلا کر تاکید کی کہ تم میرے بچوں کو ہمیشہ اپنا ہی سمجھ کر اچھی طرح رکھنا اگر ان کو کوئی ایذا پہنچی تو میری روح کو اطمینان نصیب نہیں ہوگا۔

اس طرح رشید کے ذمے ایک ایسے فرض کی ادائیگی ہوگئی جس کے لئے وہ کسیطرح پابند نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اسے اپنے الفاظ کا پاس تھا۔ اس نے ان بچوں کی عمدہ پرورش کا وعدہ

کرلیا تھا۔ جب کہ اسکی مرنے والی بیوی پر زندگی کے آخری لمحات گذر رہے تھے۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا۔ کہ میں اپنی باقی ماندہ زندگی تنہا رہ کر گذار دونگا لیکن یار دوستوں نے اور عزیز و اقارب نے چین نہ لینے دیا۔ ان کا مشورہ یہی تھا کہ اسے دوسرا نکاح کرلینا چاہیئے۔ سب یک زبان ہو کر کہتے تھے کہ چھوٹے بچوں کی پرورش بغیر عورت کے غیر ممکن ہے۔ اول اول نورشید نے ان باتوں پر غور ہی نہیں کیا۔ لیکن آخر کہاں تک ہفتے کے ساتوں دن تک یہی ایک موضوع اسکے سامنے زیر بحث رہتا۔ وہ مخالفت کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ مگر دوسرے لوگ اصرار کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ یہاں تک کہ اسکے دل میں بھی ایک خوشگوار زندگی بسر کرنے کی آرزو پیدا ہونے لگی۔ مگر بچوں کا خیال دل سے دور نہ ہوا۔ اس نے سوچا کہ شادی کسی کنواری لڑکی سے کرنی چاہیئے اور وہ بھی ایسی شریف اور نیک طینت لڑکی ہو کہ رشک و حسد کے ماتحت ان یتیم و بیسر بچوں کو کسی قسم کی ایذا نہ پہونچائے۔ اگر وہ چاہتا تو ان بچوں کو کسی اعلیٰ قسم کی درسگاہ میں داخل کردیتا۔ جہاں بچوں کی رہائش اور ہر طرح کی تربیت کا بھی انتظام ہوتا۔ لیکن وہ یہ جانتا تھا کہ تمام دنیا طعنے دیگی کہ بے ماں باپ کے بچوں کو یتیم خانے میں جھونک دیا۔ اس لئے مجبور تھا کہ انہیں گھر پر ہی رکھے۔

بہت چھان بین کے بعد آخر اس نے کلثوم کیساتھ رشتۂ ازدواج قائم کرلیا جو اس کے ایک دوست کی بہن تھی اعلیٰ تعلیمیافتہ اور بہت خوش اخلاق۔ اس نے روز اول سے بچوں کے ساتھ ہمدردی اور اخلاص کا اظہار شروع کردیا تھا۔ اس طرح کہ گویا وہ اسی کے بچے ہیں۔ سویرے اُٹھ کر وہ ان دونوں کا منہ دُھلاتی۔ ناشتہ کا انتظام کرتی۔ اور پھر ابتدائی

تعلیم کیلئے سبق پڑھا کر اپنی موجودگی میں یاد کرائی رہتی۔ حسنہ کو سینے پرونے کا کام بھی سکھانا شروع کیا۔ شام کا وقت ان کے کھیل کے لئے مخصوص تھا۔ مگر دونوں بچے اس قدر شریر اور کام چور تھے کہ پڑھنے کی طرف توجہ ہی نہ دیتے۔ ہر وقت کھیل کود میں ان کا دھیان رہتا جب ذرا آنکھ بچتی۔ پڑوس کے بچوں میں جا ملتے۔ جنکو سوائے آوارہ پھرنے کے کوئی دوسرا کام نہیں تھا۔ یہ بھی انہی کی طرح آزاد رہنا چاہتے تھے۔ پڑوس والے بھی یہی چاہتے تھے کہ یہ دونوں بچے ان کے بچوں کے ساتھ اگر کھیلیں کیونکہ حسنہ اور جمالی کھانے پینے کی کچھ نہ کچھ چیز چھپا کر ان کے لئے لے جاتے تھے۔ اس لئے کلثوم اگر ڈانٹ ڈپٹ کرتی تو محلے کی تمام عورتیں اس کا دم ناک میں کر دیتیں کہ لاوارث بچوں کے ساتھ زیادتی کرتی ہو۔ ان دونوں کو بھی اس طرح شہ پڑتی۔ وہ ہنستے، قہقہے لگاتے۔ اور سوتیلی ماں کو منہ چڑا چڑا کر باہر بھاگ جاتے۔

وہ سبق دینے بیٹھتی تو دونوں چلا چلا کر رونے لگتے۔ محلہ کی کوئی عورت آتی اور کلثوم کو ہزار صلواتیں سنا کر بچوں کو اپنے ساتھ لے جاتی۔ دن بھر خاک دھول میں کھیلنے کے باعث ان کے کپڑے کبھی صاف ستھرے نہ رہتے۔ وہ روز ان کا سر دھو کے تیل ڈال کے کنگھی کرتی، مگر ہمیشہ ریت میں اٹے ہوئے نظر آتے۔

ابتدا میں کلثوم نے درگذر سے کام لیا۔ پھر شوہر سے شکایتیں شروع کیں۔ وہ تنبیہ کر دیتا۔ دونوں بچے دبک کر بیٹھ جاتے۔ لیکن وہ دن بھر گھر میں نہیں رہتا تھا۔ اسکے جاتے ہی وہ اپنی شرارتیں شروع کر دیتے۔ گھر میں رہتے تو کچھ نہ کچھ نقصان پہنچاتے۔ پتھر مار کر صراحی پھوڑ دی، صاف برتنوں میں چولھے کی راکھ ڈال انہیں خوب خراب کر دیا۔ کیچڑ میں بھرے ہوئے پاؤں لے جا کر اُجلے فرش

کا ستیاناس کر دیا حسنہ مشین لے کر میٹھ جاتی کہ ہم گڑیا کے کپڑے سیئں گے اور ایک دو سوئیاں توڑ کر بس کرتی۔ غریب کلثوم پریشان ہو گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ جانتی تھی کہ شوہر سے روز کی شکایت بھی اچھی نہیں۔ کیونکہ رشید پہلے تو بچوں کو دھمکا دیا کرتا تھا۔ مگر بعد میں بعض محلے والوں نے اسکے کان بھرنے شروع کر دیئے کہ سوتیلی ماں دن بھر بچوں پر ظلم کرتی ہے وہ خود بھی دیکھتا کہ حسنہ اور رحمانی اسکے سامنے نہ کسی قسم کی شرارت کرتے ہیں۔ اور نہ باہر جاتے ہیں اسے بھی یقین ہونے لگا کہ کلثوم کو ان بچوں سے عداوت ہو گئی ہے وہ زبان سے کچھ نہ کہتا۔ مگر بچوں کو بھی بے قصور جانکر کسی طرح کی سزا نہ دیتا۔ لیکن آخر کہاں تک اسے سخت کوفت ہونے لگی۔ جب باہر نکلتا۔ محلے والے اسکا پیچھا نہ چھوڑتے۔ خوب ملامت کرتے۔ کہ بچوں کا خیال نہیں رکھا جاتا، سوتیلی ماں نے انہیں جینا دشوار کر دیا ہے۔ وہ کبھی سن کر خاموش ہو جاتا۔ کبھی وعدہ کرتا کہ آئندہ انہیں تکلیف نہ پہونچیگی۔ اور کبھی محض ٹالنے کے لئے بطور مذاق کہدیتا کہ میں بھی ان کا سوتیلا باپ ہوں۔

خانگی زندگی میں بے لطفی شروع ہو گئی۔ رشید کلثوم کی طرف سے بدظن کہ اسکی وجہ سے تمام پریشانیاں ہیں۔ اور اسے شوہر سے شکایت کہ وہ دوسروں کی بات میں آ کر اسکی طرف سے اعتماد کیوں کھو بیٹھا جب کہ ذمہ دار صرف وہ نالائق بچے ہیں۔

ابھی جاڑے کی ابتدا ہی تھی کہ رشید کو نزلہ و زکام کی شکایت ہوئی۔ پھر کھانسی شروع ہو گئی۔ بخار آنے لگا۔ یہانتک کہ وہ بالکل صاحبِ فراش ہو گیا۔ دفتر سے چھٹی لے لی۔ علاج معالجہ

ہوتا رہا۔ مگر افاقہ نہ ہوا۔ کلثوم نہایت خلوص و محبت کیساتھ اسکی تیمارداری میں مشغول رہتی۔ اکثر آدھی آدھی رات تک اسی خیال میں جاگتی رہتی کہ عزیز شوہر کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اب رشید کو احساس ہوا کہ وہ حقیقتاً ایک نیک بیوی ہے۔ افترا پرداز لوگوں نے خواہ مخواہ کی شکایت کر کے اسی بدظن کر دیا تھا۔ اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ بچے بہت شریر اور بدتہذیب ہیں۔ چونکہ اب وہ دن بھر گھر میں رہنے لگا تھا۔ اس لئے انکی فطرت کا مطالعہ آسان ہوگیا۔ پہلے وہ اسکے سامنے دبے بیٹھے رہتے تھے اور صرف غیر موجودگی میں اودھم مچاتے تھے۔ لیکن اُنہوں نے دیکھا کہ اب باپ دن بھر گھر میں رہنے لگا ہے تو اسکی موجودگی کی پروا نہ رہی۔ ہر وقت لڑنا جھگڑنا۔ شور و غل۔ اور ہر قسم کی بیہودگیاں۔ وہ دل ہی دل میں جلتا۔ اور سوچتا کہ کس جرم کی پاداش میں یہ مصیبت گلے پڑی ہے۔ انکا وجود اسکے لئے سوہانِ روح ہوگیا۔ مگر ایک مرنے والی کے الفاظ اسے یاد آجاتے اور وہ سختی سے کام نہ لیتا۔

مرض بڑھتا گیا۔ اور آخر اسے اپنے بچنے کی اُمید نہ رہی۔ مرنے سے کچھ دیر قبل اس نے کلثوم کو پاس بٹھا کر آخری وصیت کی۔

"تم خوب جانتی ہو کہ یہ بچے نہ میرے ہیں نہ خود تمہارے۔ بلکہ حسن اور جمیلہ کے جسن کے مرنے کے بعد جمیلہ نے میرے ساتھ شادی کی محض اس غرض سے کہ ان بچوں کی پرورش اچھی طرح ہو۔ میں نے انکو اپنی اولاد کیطرح سمجھا۔ اور جمیلہ کے مرنے کے بعد تمہارے ساتھ رشتہ قائم کیا محض اس لئے کہ ان بچوں کی پرورش اچھی طرح ہوتی رہے۔ تاکہ جمیلہ کی روح کو کسی قسم کا صدمہ نہ پہنچے اب میرا آخری وقت ہے۔ میں تم کو ہدایت کرتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد تم دوسری شادی کر لینا،

تاکہ ان بچوں کی پرورش اچھی طرح ہوتی رہے۔ اب یہ تمہارے سپرد ہیں۔ شروع سے اب تک ہر ماں اور ہر باپ —— خواہ حقیقی یا سوتیلے —— دونوں کیلئے وبال جان بنے رہے۔ جب تم شادی کرو گی تو کچھ دنوں کے بعد تمہاری باری آئیگی، اور تمہاری زندگی کا پیمانہ لبریز ہو جائیگا۔ اس وقت تم ان بچوں کو اپنے آئندہ ہونے والے شوہر کے سپرد کر دینا، اور وصیت کرنا کہ وہ بھی کسی دوسری عورت سے شادی کرے تاکہ ان بچوں کی پرورش ہوتی رہے۔ اور میرا خیال ہے کہ تمہارے وہ شوہر بھی مرتے وقت اپنی بیوی کو ہدایت کر دینگے کہ وہ بیوہ نہ رہے۔ اور اس بیوہ کے مرنے کے بعد اس کا خاوند بھی کسی دوسری عورت سے شادی کریگا۔ میرا خیال ہے کہ ان منحوس بچوں کیلئے ماں باپ کا سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہیگا۔ وہ باری باری مرتے رہیں گے۔ اور یقیناً ہمیشہ انکی پرورش کا سامان پیدا کر دیا کرے گی۔"

رشید دم توڑ رہا تھا، کلثوم رو رہی تھی۔ اور دونوں بچے پڑوس کے گھر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ قہقہے لگا رہے تھے +

بازیچۂ اطفال!

سکوتِ شام پر غروبِ آفتاب کی سنہری کرنوں کا غازہ بکھرا ہوا تھا۔ اس لئے کائنات کے ہر ذرّے سے تبسم کی جھلک نمایاں تھی۔ اس وقت گنگا کے دلفریب مگر سنسان ساحل پر ایک لڑکا اور ایک لڑکی ریتلی زمین کے اس مختصر حصے کو بازیچۂ اطفال بنائے کھیل میں مشغول تھے۔ ان کے احساسِ ہنگامی کے مطابق اس وقت دنیا اور دنیا کی تمام کائنات سمٹ کر صرف ریت کے چمکتے ہوئے ذرّوں اور بہتے ہوئے پانی کی موجوں میں سما گئی تھی، وہ نہیں جانتے تھے کہ دوسرے طبقاتِ ارض میں کیا ہو رہا ہے۔ قدرت بھی خدا کے پیدا کئے ہوئے ان دو معصوم بچوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

لڑکا کہیں سے درخت کی چھوٹی ٹہنی لے آیا تھا۔ اور ساحل کے قریب گھٹنے ٹکائے اس سے گنگا کے پانی کو گھنگول گھنگول کر خوش ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ خود پانی بھی اس بچے کیساتھ دوستی کا رشتہ قائم کرنے کیلئے بیتاب ہے۔ کیونکہ اپنے اندرونی جوش کے باعث وہ بیرون ساحل ہو جانا چاہتا تھا۔ کچھ فاصلے پر لڑکی اپنے ایک پاؤں پر ریت جما کر اور ننھے ننھے ہاتھوں

سے تھپک تھپک کر ایک بھاڑ تیار کرنے میں مصروف تھی۔ وہ دونوں دھوبی کے بچے تھے، اسلیئے ان کے خیالات کی پرواز اسی فضا تک محدود تھی جس میں اُنہوں نے سانس لے کر زندگی گذاری تھی۔

بناتے بناتے بھاڑ سے بالکا بولی:-

"دیکھ! ٹھیک ہیں بنا تو میں تجھے چھوڑ دونگی"۔

پھر بڑے پیار سے اسے تھپک تھپک کر ٹھیک کرنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی "اس کے اوپر ایک کٹی بنا دُونگی۔ وہ میری کٹی ہوگی ـــــ اور منوہر؟ ـــــ نہیں۔ وہ کٹی میں نہیں رہیگا۔ وہ باہر ہی کھڑا کھڑا بھاڑ کے اندر آگ پر پتے اور ایندھن ڈالتا رہیگا۔ جب وہ تھک کر ہار جائیگا۔ اور مجھ سے بہت کہیگا۔ تب اُسے اپنی کٹی کے اندر بلا لوں گی"۔

منوہر اسکے ان تمام دلی تاثرات سے بے خبر اپنے کھیل میں محو تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ سمندر کے نشیب و فراز کی طرح ایک ہی وقت میں اس کے لیئے غصہ اور پیار کا اظہار کیا جا رہا ہے کبھی بے قصور اس پر عتاب نازل کرنے کا ارادہ ہوتا ہے اور کبھی رحم کھا کر سایۂ عاطفت میں لے لیا جاتا ہے۔

وہ پھر سوچنے لگی "منوہر بڑا ہی اچھا اور پیارا پیارا ہے۔ مگر ہے بڑا ڈھنگی۔ ہر وقت شرارت کرتا ہے۔ ہمیں چھیڑتا ہی رہتا ہے۔ اب اس نے ڈھنگا کیا یا ہمیں چھیڑا تو ہم اسے اپنی کٹی میں ساجھی نہیں کرینگے۔ اگر اس نے ساجھی ہونے کیلیئے بہت کہا تو اس سے شرط کرالیں گے کہ دیکھو بھئی! ہمیں چھیڑنا مت۔ یہ بات اگر وہ مان گیا۔ تب ساجھی کرلیں گے۔ اور اگر پھر بھی اس نے شرارت کی تو ہمیشہ کے لیئے ناتا توڑ کر کُٹی کر دینگے۔ پھر نہیں بولینگے"۔

لڑکی ——— سُربالا ——— زندگی کی سات بہاریں دیکھ چکی تھی۔ منوہر اس سے صرف دو سال بڑا تھا۔ وہ دونوں رشتے کے بھائی بہن تھے۔

سُربالا ایک دم اس طرح چونک پڑی۔ گویا کسی نے اسکے کان میں کوئی عجیب بات کہہ دی ہے۔ وہ سوچنے لگی یہ بھاڑ کی چھت تو گرم ہو گی۔ اس پر منوہر رہیگا کیسے؟ میں تو رہ جاؤں گی مگر وہ جلیگا ضرور۔ پھر سوچا "اس سے میں کہدوں گی بھئی! چھت بہت تپ رہی ہے۔ تم جل جاؤ گے۔ اندر مت جاؤ۔ پھر اگر وہ نہیں مانا؟ میرے پاس بیٹھنے کو آیا ہی تو؟ —— ہاں! میں کہدونگی بھئی! ٹھیرو۔ میں بھی باہر آجاتی ہوں۔ پھر وہ میرے پاس آنے کی ضد کرے گا کیا؟ —— ضرور کریگا۔ وہ ہے بڑا ہٹی۔ پھر میں اسے آنے نہیں دونگی۔ بچارا تپیگا بھلا کچھ ٹھیک ہے۔ زیادہ کہا تو میں بھی دھکا دیدونگی۔ اور کہوں گی —— اسے جل جائیگا مورکھ!

یہ سوچنے پر اسے بڑا مزا سا آیا، اس کا منہ سوکھ گیا، اسے ایسا معلوم ہوا گویا منوہر درحقیقت دھکا کھاکر زمین پر گر گیا ہے۔ وہ اس ہنسی دلانے والے مگر قابل رحم نظارہ کو بیچ سمجھکر مسکرا پڑی اس نے دو ایک زور کے ہاتھ لگا کر بھاڑ کو دیکھا۔ وہ اب بالکل تیار ہو گیا تھا۔ اور جس طرح بڑی ہوشیاری کے ساتھ ماں اپنے شیر خوار بچے کو بچھونے پر لٹاتی ہو ویسے سُربالا نے بھی اپنا پاؤں آہستہ آہستہ بھاڑ کے نیچے سے کھینچ لیا، اس کام کو کرتے وقت وہ بھاڑ کو اس طرح چمکارتی جاتی تھی گویا وہ ایک سوتا ہوا بچہ ہے جس کے اُٹھ جانیکا اندیشہ ہے۔ بھاڑ اسکے پاؤں ہی پر ٹکا ہوا تھا۔ اسے فکر تھی کہ کہیں پاؤں کا سہارا ہٹ جانے پر وہ ٹوٹ نہ جائے جب پاؤں نکال لینے پر وہ نہ ٹوٹا اور جوں کا توں ٹکا رہا تو سُربالا ایک بار خوشی سے ناچ اٹھی گویا اس نے بہت بڑی

فتح کی ہے۔ وہ فوراً ہی منوہر کو بلانے کیلئے تیار ہو گئی، تاکہ اپنی چترائی سے بنائے ہوئے پہاڑ کو دکھا کر اور زیادہ خوش ہو سکے۔

ڈھیٹ لڑکا پانی سے اُلجھ رہا تھا۔ اسے خبر بھی نہیں تھی کہ اسکی لاعلمی میں کتنی زبردست کارگذاری ہو گئی ہے۔ شاید اتنا اچھا پہاڑ اس نے خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔

مگر اس نے خیال کیا "ابھی نہیں۔ پہلے کٹی تو بنا لوں"۔

یہ سوچ کر سُربالا نے ریت کی ایک چٹکی لی اور بہت احتیاط سے پہاڑ کے اوپر ڈال دی۔ اسی طرح چار پانچ چٹکیاں اور ڈالیں۔ پھر اطمینان کا سانس لیا۔ گویا کٹی بھی تیار ہو گئی۔ اس نے خیال کیا "اب سب کام مکمل ہو چکا ہے۔ منوہر کو بلانا چاہیئے۔ مگر اپنے گھر کے پہاڑ کا اس نے پورا پورا دھیان کیا تو پتہ چلا کہ ایک کمی رہ گئی ہے "دھواں کہاں سے نکلے گا؟"— تھوڑی دیر سوچ کر اس نے ایک تنکا پہاڑ کے سر پر گاڑ دیا۔ گویا وہ دھوئیں کی چمنی تھی۔ اب تو پہاڑ تیار ہو گیا۔ اس نے آخری نظر ڈالی۔ کہیں کوئی کسر باقی نہ رہ گئی ہو۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔ اگر کوئی اس سے پوچھتا کہ پرماتما کہاں براجتے ہیں۔ تو وہ کہہ دیتی کہ میرے پہاڑ کے اندر۔

منوہر کو خود ہی اپنی سُربالا کا خیال آگیا۔ اسے یاد کر کے اس نے پانی سے ناتا توڑ دیا۔ اور ہاتھ کی لکڑی کو پوری طاقت سے گنگا کی موجوں کے سپرد کر دیا وہ چپکے چپکے قریب آیا تو دیکھا کہ سُربالا اپنے پہاڑ کے طلسمات کو سمجھنے میں مشغول ہے۔

منوہر نے زور سے قہقہہ لگایا کہ تمام فضا گونج اُٹھی۔ اور ثریا بھی چونک پڑی۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر اس زور سے لات ماری کہ بنے بنائے پہاڑ کا کام تمام ہوگیا۔ ہنستے ہنستے اسکے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ قہقہہ لگاتے ہوئے اس نے کہا۔

"شریر رانی!"

وہ موہنی مورت کی طرح بالکل خاموش کھڑی رہ گئی۔ اسکے رخسار جو چند لمحے پیشتر مسرت و انبساط کی نورانی ضیا سے دمک رہے تھے یکلخت ماند پڑ گئے۔ اس کے خیالات اسے دوسری ہی دُنیا میں لیگئے تھے۔ اسکی نظر کے سامنے ایک عظیم الشان جنت تھی جس کو اسکی قوت بازو نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ اس جنتِ جدید کی خوبصورتی اور فردوسی شان دکھانیکے لئے ایک شخص کو بلانا چاہتی تھی۔ لیکن افسوس! کہ وہی شخص آیا۔ اور اس نے لات مار کر اسکو توڑ پھوڑ کر تباہ و برباد کر دیا۔ دِلکی آرزوئیں خاک میں ملیامیٹ ہوگئیں۔ اسکی روح رنج و محن سے معمور ہوگئی۔

ہمارے لائق قارئین میں سے کوئی ہوتا تو ان ضدی بچوں کو سمجھاتا کہ یہ دنیا عارضی اور جلد ہی فنا ہونے والی ہے۔ اس میں دُکھ کیا اور سکھ کیا۔ جو جس چیز سے بنتا ہے اسی میں مِل جاتا ہے پھر افسوس اور غصے کی کیا بات ہے۔ یہ تمام نگری پانی کا بلبلہ ہے۔ پھوٹ کر کسی روز پانی ہی میں ملجائیگا۔ اور پھوٹ جانے ہی میں بلبلے کی اصلیت کا راز نہاں ہے جو اس چیز کو نہیں سمجھتے وہ رحم کے بھی مستحق نہیں۔

اری ضدی لڑکی! یہ تمام دنیا خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ ایک ایک دن اسی ذات میں جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا گھل مل کر ختم ہو جائیگی۔ تو کس لئے رنج و غم سہہ کر ملول ہو رہی ہے؟ تیرا ریت کا بنا ہوا پہاڑ جتنی جلدی بنا تھا اتنی ہی جلدی ڈھ گیا۔ خاک سے بنا تھا۔ خاک میں مل گیا۔ رنج کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ اس بننے اور بگڑنے سے تو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ جس ہستی نے لات مار کر پہاڑ توڑا ہے۔ وہ خدا کا بھیجا ہوا اور تیرے ساتھ کھیلا ہوا تیرا پریمی ہے تو بھی اس سے پریم کر۔ کیونکہ اس سارے جگت کا دوسرا نام ہی پریم نگر ہے۔ تو غیبت کو دور کر کے اس کے ساتھ اس طرح مل جا۔ جیسے ریت پھر ریت میں مل گئی۔ پرمیشور تجھ پر نئے طریقے سے اپنی کرپا کرنا چاہتے ہیں۔ تو ضدی مت بن۔ اور اپنی ہٹ کو چھوڑ دے۔ تو پرماتما کی پیدا کی ہوئی مخلوق کے ساتھ دل لگا۔ پرماتما تجھ پر دیا کرینگے۔

لیکن خود بیچاری سُربالا کے خواب و خیال میں بھی فلسفہ کے یہ دقیق رموز نہ آسکتے تھے اور نہ اسکو سمجھانے کیلئے کوئی عالم فاضل گنگا کے کنارے گیا۔ اگر کوئی جاتا بھی تو شاید اس کا تمام فلسفہ بیکار رہ جاتا کیونکہ وہ اس قدر غصہ میں بھری ہوئی تھی کہ کسی کی بات ہی نہ سنتی۔ اور اگر سنتی تو باقتضائے عمر اسے مطلق نہ سمجھ سکتی۔

خیر کچھ بھی ہو۔ وہاں صرف منوہر تھا جو فلسفہ کی اوّلیات سے بھی ناواقف تھا لیکن اسکے جذبات کی عجیب کیفیت تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اندر ہی اندر اسکے دل کو مسوس رہا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے کسی قدر ضبط سے کام لے کر کہا۔

"چل پگلی سُرو! — تو روٹھ گئی"

سُربالا ویسے ہی کھڑی رہی - ذرا نہ ہلی - نہ کچھ کہا -

"سُرتی! تو روٹھی کیوں ہے؟"

سُربالا پر پھر بھی کچھ اثر نہ ہوا -

"سُرتی! — سُربا! — او سُرو لے — بولتی نہیں مردار!"

اب تاب ضبط نہ تھی - منوہر کی آواز بھرا گئی - اور سُربالا منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی - منوہر کی کانپتی ہوئی آواز کا مقابلہ اس سے نہیں ہو سکتا تھا - وہ بظاہر خفا اور خاموش تھی - مگر خوب پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی -

"سُرتی! — او سُربا! میں منوہر ہوں منوہر - مجھے مارتی نہیں - دیکھ میں کھڑا ہوں - تو مجھے مار"

یہ منوہر نے اسکی پیٹھ کے پیچھے کھڑے ہو کر کہا - اور کچھ ایسی آواز میں گویا وہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ اسکے آنسو نہیں بہ رہے - حالانکہ وہ بہ رہے تھے -

"ہم نہیں بولتے جی - نہیں بولتے"

وہ بولنا نہیں چاہتی تھی مگر بولے بغیر رہا بھی نہ گیا - کیونکہ اس کا بچارا، اسکی ساری دنیا، بلکہ خود اس کا وجود منوہر کی بھرائی ہوئی آواز میں جذب ہو کر اپنی خودی کو مٹا چکا تھا - منوہر نے اپنے جوش کو دبا کر کہا -

سُرو! منوہر تیرے پیچھے کھڑا ہے وہ بڑا پاپی ہے - تو اس سے بول مت لیکن

تو خفا ہو کر اسکے سر پر ریت کیوں نہیں ڈال دیتی۔ اس نے تیرا اکھاڑ توڑا ہے، تو اسکے بال خراب کردے۔ تو اسے مار کیوں نہیں دیتی۔ ایک تھپڑ لگا۔ وہ اب کبھی شرارت نہیں کریگا۔"

سُرمالا نے کڑک کر کہا۔

"چُپ رہو جی۔ ہم نے کہدیا۔ ہم نہیں بولنے۔"

"چپ رہوں گا۔ لیکن کیا مجھے دیکھو گی بھی نہیں؟ بالکل روٹھ گئیں؟"

"ہاں! روٹھ گئے۔ نہیں، یکھنے۔ تمہیں کیا؟"

"اچھا مت دیکھو۔ میں اب کبھی سامنے نہیں آؤنگا۔ میں اسی لائق ہوں۔"

"کہہ دیا تم سے۔ تم چپ رہو۔ ہم نہیں بولنے۔"

ضدی لڑکی کا تمام غصّہ اور رنج کبھی کا ختم ہو چکا تھا۔ وہ نرم پڑ گئی تھی۔ ظاہری باتوں کا مطلب کچھ اور ہی تھا۔ اسکی مسرت غصّے کے روپ میں جلوہ گر ہوئی تھی۔ دوسرے الفاظ میں بچپن کی معصومیت پر شرارت غالب آ چلی تھی۔ منوہر بولا۔

"لو سُرو! میں نہیں بولتا۔ میں بیٹھ جاتا ہوں۔ یہیں بیٹھا رہونگا۔ تم جب تک نہیں کہوگی۔ نہ اُٹھونگا۔ نہ بولونگا۔"

منوہر چپ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ہار کر سُرمالا بولی

"ہمارا اکھاڑہ کیوں توڑا جی؟ ہمارا اکھاڑہ بنا کے دو۔"

"لو۔ ابھی لو"

"ہم ویسا ہی لیں گے"

ویسا ہی لو۔ اس سے بھی اچھا"

"اس پر بہاری کٹی تھی۔ اس پر دھوئیں کا راستہ تھا"

"لو۔ سب لو۔ تم بتاتی جاؤ۔ میں بناتا جاؤں"

"ہم نہیں بتائیں گے۔ تم نے کیوں توڑا؟ تم نے توڑا۔ تم ہی بناؤ"

"اچھا! پر تم ادھر دیکھو تو"

"ہم نہیں دیکھتے۔ پہلے پہاڑ بنا کے دو"

منوہر نے ایک پہاڑ بنا کے تیار کیا۔ پھر کہا۔

"لو پہاڑ بن گیا"

"کیا بن گیا۔ بالکل ویسا ہی"

"ہاں! خود دیکھ لو"

"دھوئیں کا راستہ بنایا؟ کٹی بنائی؟"

"وہ کیسے بناؤں؟ تم بتاؤ تو"

"پہلے بناؤ۔ پھر بتاؤنگی"

منوہر نے پہاڑ کے سر پر ایک سینک گاڑ کر اور ایک پتے کی اوٹ لگا کر کہا۔

"بنا دیا دھوئیں کا راستہ۔ دیکھ لو"

فوراً مُڑ کر سُر بالا نے کہا۔

"سینگ ٹھیک نہیں لگی جی! پتہ ایسے لگیگا جی۔ اچھا اب جا کر تھوڑا پانی لاؤ۔ بھاڑ کے سر پر ڈالیں گے۔

منوہر پانی لایا اور چلّو میں لے کر بھاڑ کی مٹی پر چھڑکنا چاہتا تھا کہ خود سُر بالا نے ایک لات مار کر بھاڑ کو پہلے کی طرح چکنا چور کر دیا۔ اور ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئی۔

منوہر بھی خوشی سے ناچ اُٹھا۔

گنگا کا پانی بچے کی ہنسی سے ملتی جلتی مدہم آواز کے ساتھ آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ سورج کی آخری شعاعوں کا الوداعی تبسم صرف دو بلند درختوں کی چوٹیوں پر نظر آرہا تھا۔ ہوا کی رفتار میں ایک عجیب لطافت محسوس ہو رہی تھی۔ گھنے درخت سر جھکائے ہوئے فلسفیوں کی طرح اپنے خیالات میں محو معلوم ہوتے تھے۔ بڑھتی ہوئی تاریکی کے اندیشے سے سُر بالا اور منوہر ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر گھر کی طرف چل پڑے۔ اب ان میں سے کسی ایک کے دل میں بھی غصہ یا رنج کا نام تک نہیں تھا۔

کیا عورت ناقص العقل ہے؟

تاریخ یونان کا ایک گمشدہ ورق

سکندر۔ کرۂ ارض کا فاتح اعظم سکندر۔ ممالک محروسہ سے خراج لیتا۔ اپنی سلطنت کے حدود کو وسیع کرتا۔ گرجتے ہوئے بادل اور کڑکتی ہوئی بجلی کی مانند تباہی و بربادی کا طوفان لے کر ہمت و استقلال، اور عزم و ارادہ کو سینے میں لئے بڑھتا چلا جاتا تھا۔ موسم گرما کے جھلستے ہوئے آفتاب کی شعاعیں، موسم سرما کی خون منجمد کر دینے والی ہوا کے تیز و تند جھونکے اسکی نظر میں کچھ وقعت نہ رکھتے تھے۔

اسی دوران میں اس کا گذر ایک ایسی سرزمین میں ہوا جس کی عنان حکومت صنف نازک کے قوی ہاتھوں میں تھی اور بیشتر آبادی بھی اسی جنس پر مشتمل تھی۔ سکندر اس سے بےخبر تھا کہ کائنات عالم کا نظم و نسق صرف عورت ہی کے دم سے ہے۔ اس لئے ارادہ کیا۔ کہ حسب معمول فوج کشی کر کے اس ریاست کو بھی فتح کر لے۔

سمندر میں یکے بعد دیگرے بڑھنے والی موجوں کی طرح فوج کی قطاریں آراستہ کی جا رہی

تھیں۔ کہ سکندر کی بارگاہ میں ایک عورت آلاتِ حرب سجائے لوہے میں ڈوبی ہوئی حاضر ہوئی اور مودبانہ طریقے پر ایک منقش شمشیر نذر کرتے ہوئے اپنی ملکہ کا پیغام پیش کیا۔

"اے سکندر یہ حقیقت ہے کہ اس وقت بڑی بڑی سلطنتوں پر تیرا پرچم لہرا رہا ہے اور تیرے نام کا سکہ خشکی اور تری پر رواں ہے۔ لیکن تیرے حق میں بہتر یہی ہے۔ کہ ہمارے مقابلہ میں نبرد آزمائی کے خیال خام کو ترک کر کے اپنی راہ لے۔ اگر اس میدانِ کارزار میں تجھ کو فتح بھی ہوگئی۔ تو بے سود ہے۔ کیا تاریخ عالم میں تیرے نام کے ساتھ یہ حرف نہیں لکھے جائینگے کہ "بے رحم سخت دل سکندر نے صنف نازک کے مقابلہ میں شمشیر اٹھائی۔ اور اسکے بہادر سپاہیوں نے کمزور عورتوں کو تہ تیغ کیا؟" تصویر کے دوسرے رخ کو مدنظر رکھتے ہوئے سوچا جائے کہ اگر حسن اتفاق سے ہمیں فتح ہوئی جس کا ہمیں یقین ہے۔ کیونکہ ہماری فوج کا ہر رکن فن سپہ گری میں یکتائے روزگار ہے۔ تو کیا یہ امر تیرے لئے زبردست ذلت کا باعث نہیں ہوگا۔ کہ "سکندر کو ـــــ سکندر اعظم کو ـــــ صنف نازک نے شکست دیدی۔ اور اسکے بہادر سپاہیوں کو کمزور خواتین کی تیز تلواروں نے خون میں نہلا دیا۔" لہذا قبل اس کے کہ تیر اپنی کمان سے جدا ہو انجام پر نظر ڈال لینی ضروری ہے۔"

سکندر جس کا عزم راسخ۔ جس کا ارادہ قوی جس کا قانون اٹل اور جس کا فیصلہ قطعی ہوتا تھا یہ معقول بات سن کر دنگ رہ گیا۔ اور فوراً اپنی فوجوں کو وطن کی طرف مراجعت کا حکم دیدیا۔ نیز شہر پناہ کے صدر دروازے پر خود اپنے ہاتھ سے یہ عبارت کندہ کردی۔

"کج فہم سکندر بیشمار سلطنتوں کو مغلوب کرنیکے بعد اس زمین پر آیا۔ اور اس نے عورت کی دانشمندی کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ مرد قوتِ بازو سے فتح حاصل کرتے ہیں۔ اور صنف نازک عقل و دانائی سے۔"

نصف ایکٹ کا ڈرامہ

افراد تمثیل

سر بالا :- تہذیب مغربی کی دلدادہ ایک نوجوان خاتون۔

منوہر :- شانتی نکیتن کا ایک عاشق مزاج طالب علم۔

منظر

صبح کا وقت۔ گوشۂ چمن، چشمے کی روانی، طیور کے چہچہے، آہنی بنچ، ایک مرد، ایک عورت، ایک کتا

مقام :- حدیقہ نباتات کلکتہ   زمانہ :- عصر جدید۔

منوہر:- (مضمحل لہجہ میں) سُربالا! کس قدر حیرت انگیز امر ہے۔ میں عرصہ دراز سے تمہاری محبت میں گرفتار ہوں ——— مگر تم کو ذرا بھی احساس نہیں۔

سُربالا:- (لبوں کو چباتے ہوئے) نہیں منوہر! تمہارا خیال ہے۔ میں محبت کا جواب محبت سے دیتی ہوں ——— مگر تم خود اس حقیقت کو محسوس نہیں کرتے۔

(نگاہیں جُھک جاتی ہیں)

منوہر:- (خفیف تبسم کے ساتھ) تو پھر کیوں نہ ہم ایکدوسرے کے شریک حیات بن جائیں؟ کیا تمہیں کچھ پس و پیش ہے؟

سُربالا:- (مصنوعی حیا سے) ہرگز نہیں۔ یہ تو میری دلی آرزو ہے۔ میں تیار ہوں جب جی میں آئے۔ چاہے کل ہی سہی۔

(چار متبسم لب ——— ایک طویل بوسہ)

پردہ گرتا ہے

ادبِ رنگین کی دلآویز کتابیں

نرگس جمال :- مصنفہ موریس میٹرلنک، مترجمہ شاہد احمد بی، اے (آنرز) قیمت ...... عہ/

پروین و ثریا :- مصنفہ موریس میٹرلنک، مترجمہ شاہد احمد، و فضل حق قریشی۔ قیمت ۱۲/

سرگذشت عروس :- ایک دلہن کا روزنامچہ از شاہد احمد دہلوی۔ قیمت .... عہ/

چندرا موہنی :- حسن و عشق کی دردناک کہانی، از انصار ناصری۔ بی۔ اے دہلی قیمت ...... عہ/

نجمہ نوری :- ماں کی ممتا سے متعلق ایک عبرتناک داستان، از انصار ناصری دہلوی قیمت .. ۱۲/

سلومے :- شہرۂ آفاق آسکر وائلڈ کی مشہور تمثیل، سالومی کا ترجمہ قیمت ۸/

تعلیم زدہ بیوی: عورتوں کی غلط تعلیم کے بُرے نتائج پُرلطف پیرایہ میں بیان کیے ہیں قیمت ۸/

لال قلعہ کی ایک جھلک :- مصنفہ ناصر نذیر فراق دہلوی۔ دلی کے لال قلعہ کی چہل پہل۔ قیمت۔ عہ/

دلی کا آخری دیدار :- ایک شہزادی کی زبانی غدر سے پہلے کی عبرتناک کہانی قیمت ۱۲/

اخوان الشیاطین :- سائنٹفک افسانوں کا مجموعہ۔ بالکل نئے طرز کے افسانے قیمت .. ۱عہ/

نجم السحر :- مترجمہ مولوی عنایت اللہ بی۔ اے۔ سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن قیمت .... عہ/

ملنے کا پتہ

ساقی بک ڈپو دہلی

مکمل فہرست مفت

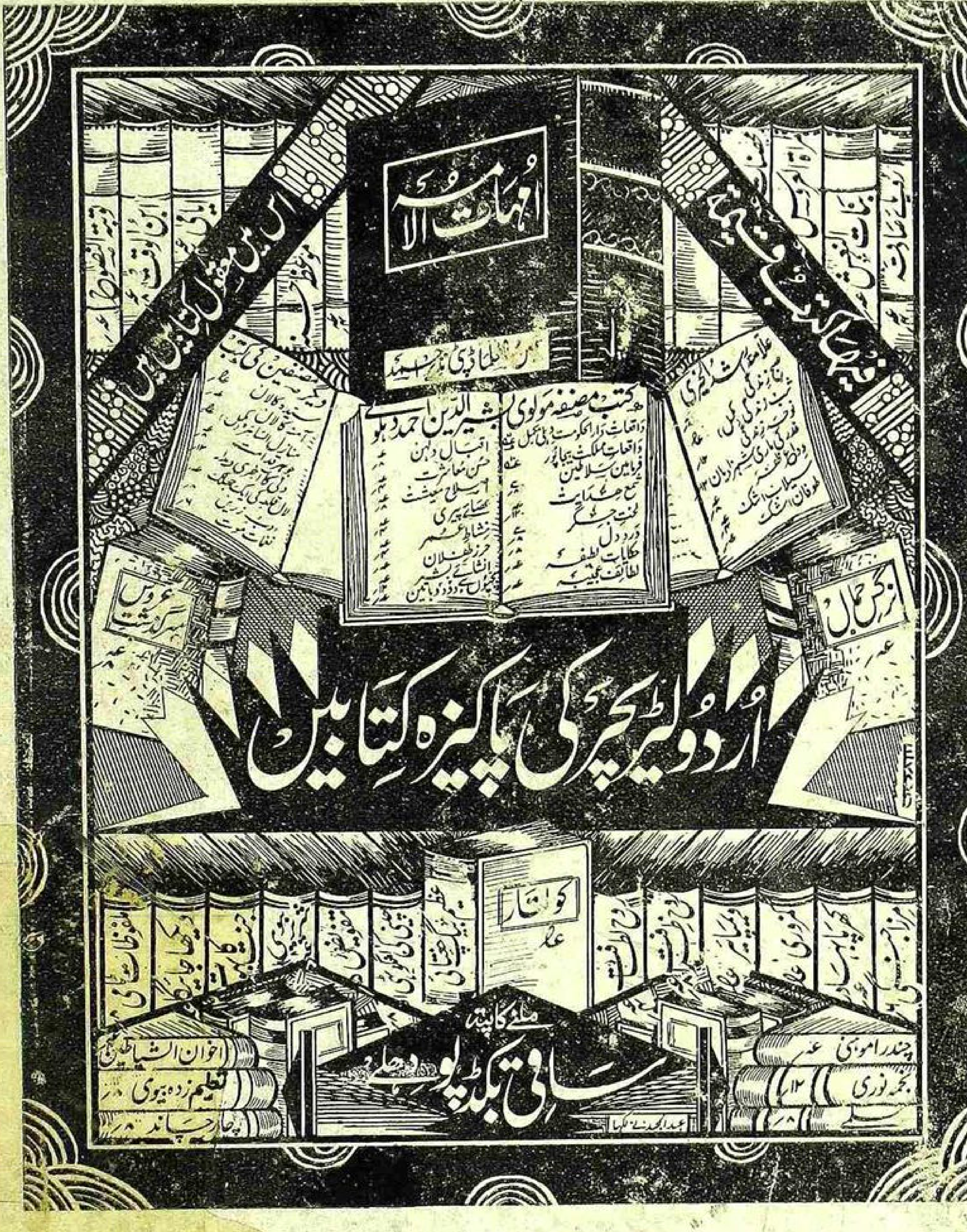

اُمہات الامہ
کتب مصنفہ مولوی بشیر الدین احمد دہلوی
اس میں مقبول کتابیں ہیں
اردو لٹریچر کی پاکیزہ کتابیں
ملنے کا پتہ
ساقی بکڈپو دہلی